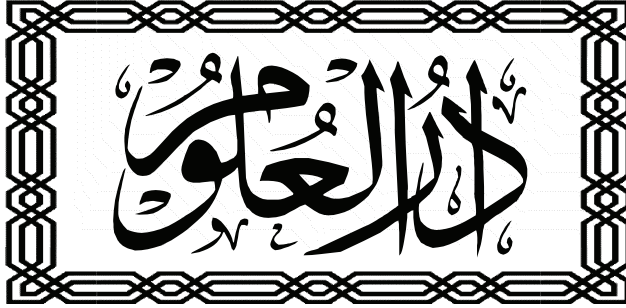


دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ



جلد: ۹۸ شوال، ذی قعدہ ۱۴۳۵ھ مطابق اگست، ستمبر ۲۰۱۴ء شماره: ۸-۹

مدیر

نگراں

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔ ۲۴۷۵۵۴ یو پی

ہندوستان سے فی شمارہ:- ۲۰ روپے، سالانہ:- ۲۰۰ روپے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ:- ۱۱۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ:- ۵۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم:- ۵۰۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768

Web : http://www.darululoom-deoband.com

www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine

E-mail: info@darululoom-deoband.com

www.pakistaniweb.net

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	حبیب الرحمن اعظمی	۳
۲	ذی الحجہ کا پہلا عشرہ اور قربانی کے احکام و مسائل	محمد نجیب قاسمی	۶
۳	اسلام کا مشاورتی نظام، اہمیت اور طریقہ کار	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۱۴
۴	ٹخنوں سے نیچے کپڑا لگانے کا شرعی حکم	مولانا امداد الحق بختیاری قاسمی	۲۷
۵	قرآن فہمی اور ہمارے درمیان حائل پردے	حکیم سید مزمل حسین نقشبندی	۴۳
۶ استفادہ کا منہاج	ڈاکٹر مولانا فخر الاسلام مظاہری	۴۹
۷	صحابہ ستہ، تعارف و خصوصیات	مولانا اشرف عباس قاسمی	۷۱
۸	ہماری اخلاقی پستی، مظلومیت اور ذلت کا....	بیگی نعمانی	۷۹
۹	ایمان و اعمال کے لیے مجاہدہ کی ضرورت	محمد ضمیر رشیدی	۹۱
۱۰	انسانی قانون کا کافی نہیں....	ڈاکٹر ایم اجمال فاروقی	۹۴
۱۱	بہترین شخص	ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی	۹۹
۱۲	یکتا زمانہ - عبداللہ ابن مبارک	مولانا محمد مجیب الرحمن دیودرگی	۱۰۷

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار مئی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے دی پی میں صرف زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شہیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمن عظمیٰ

اسلامی تاریخ میں فتنہ ارتداد اور یورشِ تاتار کے بعد غالباً ایسا ہیڈ آ شوب اور نازک ترین وقت کبھی نہیں آیا، جس اُٹھل پٹھل، انتشار و اختلال اور مظلومیت و بیچارگی سے آج قومِ مسلم دوچار ہے، چین سے لے کر کاشغر؛ بلکہ اس سے بھی ماوراءِ دنیا کے ہر خطہ اور علاقہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت، علوم و آثار ہی نہیں؛ بلکہ قومِ مسلم کا وجود ظلم پیشہ طاقتوں کے نرغے میں ہے اور خداے وحدہ لاشریک لہ کی زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ سے تنگ تر بنادی گئی ہے، بالخصوص امریکہ و اسرائیل کی خوئے انسان کشی اور خصلتِ خون آشامی سے عالمِ اسلام مقتل بنا ہوا ہے، جو مسلم حکومتیں ابھی تک ان کی فتنہ سامانیوں اور چیرہ دستیوں سے بچی ہوئی ہیں، وہ بھی امریکہ کے مزاج اور رویہ کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ اپنی قدیم وفاداریوں کے باوجود اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن ہیں، اور ڈری سبھی اپنی خانہ خرابی کے دن رکن رہی ہیں، تادم تحریر اسرائیل نے نبیوں اور پیغمبروں کی سرزمین کو خود ان کے نام لیواؤں کے خونِ ناحق سے رنگین بنادی ہے، تقریباً آٹھ برسوں سے محصور و مقہور مٹھی بھر جماعتِ اسرائیل کے ایٹمی ہتھیاروں اور اس کی ریزرو فوج کی سنگینوں کی زد میں ہے، اب تک دو ہزار سے زائد لوگ جاں بحق ہو چکے ہیں، جن میں چھ سو سے اوپر معصوم بچے، نحیف و زار بوڑھے اور خانہ نشین نازک خاتون شامل ہیں، امریکہ کے ڈر سے کسی کو اسرائیلی درندوں سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہے کہ ان معصوم نوہالوں، بے سکت بوڑھوں، نازک و ناتواں عورتوں نے کتنے میزائل داغے تھے، جس کی پاداش میں انھیں ہمیشہ کے لیے خاک پر سلا دیا گیا ہے، خود امریکہ جو اس وقت عراق میں عیسائی اور یزیدی اقلیتوں کے جانی حق کے تحفظ کے نام پر داعش پر مسلسل فضائی حملے کر رہا ہے، اسی نام نہاد انسانی حقوق کے محافظ امریکہ نے غزہ میں آباد فلسطینیوں پر اسرائیل کے اس حالیہ حملہ کے وقت جارح و قاتل اسرائیل کی ہمت بڑھانے

کے لیے اس کی اسلحوں اور ڈالروں سے بھرپور امداد کی، گویا اس کے نزدیک یہ مظلوم دنیا میں جینے کا حق نہیں رکھتے ہیں؛ اس لیے صفحہ ہستی سے حرف غلط کی مانند ان کا نام و نشان مٹا دینا ہی انسانیت کی خدمت اور حقوقِ انسانی کی پاسداری ہے۔ امریکہ اور اس کے نشانِ قدم کی پیروی کرنے والوں کا حق و انصاف سے عاری یہی وہ مذموم و مسموم رویہ ہے، جس نے دنیا کو دہشت گردی کے جہاں سوز عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، اگر ان ایک طرفہ مظالم اور نا انصافیوں سے یہ لوگ دست بردار ہو جائیں تو یقیناً جانے کہ دنیا سے اسی دن دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس موقع پر ہم حماس کے مجاہدین کی جرأت و عزیمت اور غیرت و حمیت کو سلام کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، اسرائیل کی جانب سے آٹھ سالہ اذیت ناک اور ہلاکت خیز ناکہ بندی کے باوجود ان کے پائے استقامت میں ادنیٰ لغزش نہیں آئی، اپنے دستیاب معمولی ہتھیاروں سے انھوں نے جدید اسلحوں سے لیس تازہ دم اسرائیلی فوج کا اس جرأت و حوصلہ سے مقابلہ کیا کہ ان کے سارے عزائم و منصوبے خاک میں مل گئے، اسرائیل اسی خیال میں تھا کہ اس آٹھ سالہ سنگین حصار سے وہ اس قدر ٹوٹ گئے ہوں گے کہ ان میں تابِ مقاومت نہیں ہوگی، ہمارے اولین حملہ ہی میں وہ بھاگ کھڑے ہوں گے، مگر اللہ کے ان مظلوم بندوں نے قدیم عرب مجاہدین کے صبر و استقامت کی یاد تازہ کر دی، اسرائیل کے آتشیں گولوں سے ان کے گھر جلتے رہے، ان کے بچے بوڑھے اور عورتیں ان کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں لوٹتے رہے پھر بھی وہ اس حوصلہ اور پامردی کے ساتھ اسرائیلی لشکر کا مقابلہ کرتے رہے کہ بعض محاذوں پر انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

جنگوں میں ہتھیار ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس سے بے توجہی بلاشبہ ایک جرم ہے، پھر بھی ان میں بالعموم سرخ روئی اور سرفرازی کا سہرا ایمان کی صداقت، خداے جی و قیوم پر کئی اعتماد، مقصد سے والہانہ شیفنگی اور اخلاص و عزیمت ہی کے سر بندھا ہے، اسی ارضِ فلسطین اور بیت المقدس کو چھٹی صدی کے مجدد صلاح الدین ایوبی نے صلیب کے مشرکانہ پنجے سے واگزار کیا تو بتایا جائے کہ دنیا کی کتنی مادی طاقت ان کے پشت پر تھی؟ کیا اس وقت کے مقابل حریف نے اپنی طاقت و قوت کو مجتمع کرنے میں کوئی کسر باقی چھوڑی تھی؟ تاریخ بتاتی ہے کہ روئے زمین کی ساری صلیبی طاقتیں ایک صلاح الدین کے مقابلہ کے لیے اس چھوٹے سے شہر میں اکٹھا ہو گئی تھیں، اس وقت کے تمام جنگ آزماسور ماور تاجدارانان کج کلاہ قیصر، فریڈرک، شیرول، اور شاہانِ انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریلیا وغیرہ سب نے متحدہ طور پر اپنی آہنی فوجوں کے ساتھ اس خطہ مقدس پر یلغار کی تھی اور اللہ کا ایک سچا بندہ ان سب کے مد مقابل تنہا اپنے مجاہدوں کے لیے کھڑا تھا،

پھر کیا ہوا! دنیا نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ اس ایمان و یقین کے دھنی، صبر و استقامت کے پیکر، حریم اسلام کے مخلص محافظ نے صلیبیوں کی متحدہ طاقت کو اس طرح پامال کیا کہ انھیں صدیوں سراٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی، انھوں نے مسیحی کمانڈر ریچی نالڈ کو جس وقت تہ تیغ کیا تو ان کی زبان پر یہ جملہ تھا ”ہَا اَنَا اَنْتَصِرُ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“، ”لو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقام لے رہا ہوں، اس گستاخ نے مکہ و مدینہ پر حملہ کی بات کہی تھی، سلطان ایوبی کا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ان کی لڑائی ملک و قوم اور حکومت و سلطنت کے لیے نہیں؛ بلکہ محض اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لیے تھی، مؤرخین یہ بھی صراحت کرتے ہیں کہ وہ دن بھر میدان جنگ میں اس طرح بے تابانہ سرگرداں رہتے جس طرح ایک ماں اپنے نونہال کے لیے غمزہ پھرتی ہے اور راتوں کو وہ خدائے واحد اور مالک کائنات کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر اس قدر گڑگڑاتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔

ظاہری حرب و ضرب کے ہتھیاروں کی قوت کے ساتھ ہمارے اسلاف اور پیش رو قائدین کی یہی وہ باطنی قوت تھی جس کے آگے بڑی سے بڑی مادی طاقتیں سرنگوں ہو جاتی تھیں۔ بدر و حنین اور قادسیہ و یرموک نے ہمیں جو راہ دکھائی تھی اسے چھوڑ کر ہم نے مغضوب علیہم اور ضالین کے راستے کو اختیار کر لیا ذلت و بے حیثیتی اور کج روی جن کے گلے کا ہار ہے، ہماری اسی رجعت قہقری کا وبال ہے جس سے قوم مسلم آج دوچار ہے، اس عمومی بے راہ روی اور اس کی پاداش میں عمومی خانما بربادی کے عہد میں غزہ کے جوانوں نے اسلاف اور اپنے بزرگوں کا معمولی سا نمونہ پیش کیا تو ان کی مزاحمت کے آگے آلاتِ جدیدہ سے لیس اسرائیلی حیران و ششدر رہے کہ ان کے اندر یہ طاقت کہاں سے آگئی ہے۔

افسوس کہ ہم نے اپنی کم ہمتی، غفلت شعاری، راحت پسندی اور ناعاقبت اندیشی سے اپنے دامن میں سب کچھ ہوتے ہوئے تہی دامن کو اپنا نصیب بنا لیا ہے، آج نہ ہمارے پاس ظاہری اسباب و وسائل ہیں جن سے دشمن طاقت کا مقابلہ کر سکیں اور نہ باطنی قوت کہ نصرتِ الہی ہماری دست گیری کرے، ہم نے خود اپنے کردار و اخلاق سے اپنے آپ کو اس قدر ناکارہ اور بے حیثیت بنا لیا کہ وقت پڑنے پر ہم ایسے لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں، ذلت و مسکنت جن کے گلے کا ہار اور جہالت و ضلالت جن کی زندگی کا شعار ہے، کیا صورتِ حال ہمارے لیے تازیانہ عبرت نہیں ہے!

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِّمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ.

ذی الحجہ کا پہلا عشرہ اور قربانی کے احکام و مسائل

از: محمد نجیب قاسمی، ریاض

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ الْكَرِيمِ وَعَلَىٰ آلِهِ
وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ.

ماہ ذی الحجہ کا پہلا عشرہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم (سورۃ الفجر آیت نمبر ۲) میں ذی الحجہ کی دس راتوں کی قسم کھائی ہے
(وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ) جس سے معلوم ہوا کہ ماہ ذی الحجہ کا ابتدائی عشرہ اسلام میں خاص اہمیت
کا حامل ہے۔ حج کا اہم رکن:وقوف عرفہ اسی عشرہ میں ادا کیا جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے خاص فضل
و کرم کو حاصل کرنے کا دن ہے۔ غرض رمضان کے بعد ان ایام میں اخروی کامیابی حاصل کرنے کا
بہترین موقع ہے۔ لہذا ان میں زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کریں، اللہ کا ذکر کریں، روزہ
رکھیں، قربانی کریں۔ احادیث میں ان ایام میں عبادت کرنے کے خصوصی فضائل وارد ہوئے
ہیں، جن میں سے چند احادیث ذکر کر رہا ہوں:

✽ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد
فرمایا: کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں نیک عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں ان دس دنوں کے عمل سے زیادہ
محبوب اور پسندیدہ ہو۔ (صحیح بخاری)

✽ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ
تعالیٰ کے نزدیک عشرہ ذی الحجہ سے زیادہ عظمت والے دوسرے کوئی دن نہیں ہیں، لہذا تم ان دنوں
میں تسبیح و تہلیل اور تکبیر و تہمید کثرت سے کیا کرو۔ (طبرانی) ان ایام میں ہر شخص کو تکبیر تشریق پڑھنے
کا خاص اہتمام کرنا چاہیے، تکبیر تشریق کے کلمات یہ ہیں: اللَّهُ أَكْبَرُ. اللَّهُ أَكْبَرُ. لَا إِلَهَ إِلَّا
اللَّهُ. وَاللَّهُ أَكْبَرُ. اللَّهُ أَكْبَرُ. وَلِلَّهِ الْحَمْدُ.

عرفہ کے دن کا روزہ:

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عرفہ کے دن کے روزے کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پختہ امید رکھتا ہوں کہ وہ اس کی وجہ سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔ (صحیح مسلم) مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ عرفہ کے دن کا ایک روزہ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کی معافی کا سبب بنتا ہے۔ لہذا نویں ذی الحجہ کے دن روزہ رکھنے کا اہتمام کریں۔

وضاحت: اختلاف مطالع کے سبب مختلف ملکوں میں عرفہ کا دن الگ الگ دنوں میں ہوتا اس میں کوئی اشکال نہیں؛ کیونکہ یوم عید الفطر، یوم عید الاضحیٰ، شبِ قدر اور یومِ عاشورہ کے مثل ہر جگہ کے اعتبار سے جو دن عرفہ کا قرار پائے گا، اُس جگہ اُسی دن میں عرفہ کے روزہ رکھنے کی فضیلت حاصل ہوگی، انشاء اللہ۔

قربانی کی حقیقت:

قربانی کا عمل اگرچہ ہر امت کے لیے رہا ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (سورہ الحج ۳۴) ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی؛ تاکہ وہ چوپایوں کے مخصوص جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے؛ لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اہم و عظیم قربانی کی وجہ سے قربانی کو سنتِ ابراہیمی کہا جاتا ہے اور اسی وقت سے اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی؛ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی عظیم قربانی کی یاد میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر حضور اکرم ﷺ کی اتباع میں جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔ اس قربانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں اپنی جان و مال و وقت ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹوں کی قربانی پیش فرمائی تھی جس میں سے ۶۳ اونٹ کی قربانی آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے کی تھی اور بقیہ ۳۷ اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نحر (یعنی ذبح) فرمائے۔ (صحیح مسلم۔ حجۃ النبی ﷺ) یہ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد (ذی الحجہ ۱۰) تاریخ کو کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں) کا عملی اظہار ہے اور اس عمل میں اُن حضرات کا بھی جواب ہے جو مغربی تہذیب

سے متاثر ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی کے بجائے غریبوں کو پیسے تقسیم کر دیے جائیں۔ اسلام نے جتنا غریبوں کا خیال رکھا ہے اس کی کوئی مثال کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی؛ بلکہ انسانیت کو غریبوں اور کمزوروں کے درد کا احساس شریعتِ اسلامیہ نے ہی سب سے پہلے دلایا ہے۔ غریبار و مساکین کا ہر وقت خیال رکھتے ہوئے شریعتِ اسلامیہ ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم عید الاضحیٰ کے ایام میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی عظیم قربانی کی یاد میں اپنے نبی اکرم ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے قربانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، جیسا کہ ساری انسانیت کے نبی حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کام میں مال خرچ کیا جائے تو وہ عید الاضحیٰ کے دن قربانی میں خرچ کیے جانے والے مال سے زیادہ فضیلت نہیں رکھتا۔ (سنن دارقطنی، سنن کبریٰ للبیہقی)

ان دنوں بعض حضرات نے باوجودیکہ کہ انہوں نے قربانی کے سنتِ مؤکدہ اور اسلامی شعار کا موقف اختیار کیا ہے ۱۴۰۰ سال سے جاری و ساری سلسلہ کے خلاف اپنے اقوال و افعال سے گویا یہ تبلیغ کرنی شروع کر دی ہے کہ ایک قربانی پورے خاندان کے لیے کافی ہے اور قربانی کم سے کم کی جائے جو سراسر قرآن و حدیث کی روح کے خلاف ہے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کی روشنی میں امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ ان ایام میں زیادہ سے زیادہ قربانی کرنی چاہیے۔ دیگر اعمال صالحہ کی طرح قربانی میں بھی مطلوب و مقصود رضا الہی ہونی چاہیے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (سورۃ الانعام ۱۶۲) میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کی رضامندی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ نیز اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهُ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ (سورۃ الحج ۳۷) اللہ کو نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اُن کا خون؛ لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

قربانی کی اہمیت و فضیلت:

✽ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرمایا (اس قیام کے دوران) آپ ﷺ قربانی کرتے رہے۔ (ترمذی۔ ابواب الاضاحی) غرضیکہ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ایک مرتبہ بھی قربانی ترک نہیں کی باوجودیکہ آپ ﷺ کے گھر میں بوجہ قلتِ طعام کئی مہینے چولہا نہیں جلتا تھا۔

✽ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

نے حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا، یا رسول اللہ ﷺ! یہ قربانی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ہمیں قربانی سے کیا فائدہ ہوگا؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اون کے بدلے میں کیا ملے گا؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اون کے ہر بال کے بدلے میں (بھی) نیکی ملے گی۔ (سنن ابن ماجہ - باب ثواب الاضحیہ)

❁ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کو کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا (اور یہ چیزیں اجر و ثواب کا سبب بنیں گی) اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے، لہذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو۔ (ترمذی - باب ماجاء فی فضل الاضحیہ)

❁ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کام میں مال خرچ کیا جائے تو وہ عید الاضحیٰ کے دن قربانی میں خرچ کیے جانے والے مال سے زیادہ فضیلت نہیں رکھتا۔ (سنن دارقطنی باب الذبائح، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۲۶۱)

قربانی کا وجوب:

قربانی کو واجب یا سنت مؤکدہ قرار دینے میں زمانہ قدیم سے اختلاف چلا آ رہا ہے؛ مگر پوری امت مسلمہ متفق ہے کہ قربانی ایک اسلامی شعار ہے اور جو شخص قربانی کر سکتا ہے اس کو قربانی کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے خواہ اس کو واجب کہیں یا سنت مؤکدہ یا اسلامی شعار۔ حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں ہمیشہ قربانی کیا کرتے تھے باوجودیکہ آپ ﷺ کے گھر میں اشیاء خوردنی نہ ہونے کی وجہ سے کئی کئی مہینے تک چولہا نہیں جلتا تھا۔ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں قربانی کو واجب قرار دیا ہے، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمد ابن حنبلؒ کی ایک روایت بھی قربانی کے وجوب کی ہے۔ ہندو پاک کے جمہور علماء نے بھی وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے؛ کیونکہ یہی قول احتیاط پر مبنی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی قربانی کے وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے۔ قربانی کے وجوب کے لیے متعدد دلائل میں سے

چند پیش ہیں:

(۱) اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن کریم (سورۃ الکوثر) میں ارشاد فرماتا ہے: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔ اس آیت میں قربانی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور امر عموماً وجوب کے لیے ہوا کرتا ہے، جیسا کہ مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔ علامہ ابوبکر جصاص^(۱) (ولادت ۳۰۵ھ) اپنی کتاب (احکام القرآن) میں تحریر کرتے ہیں: حضرت حسن بصری^(۲) فرماتے ہیں کہ اس آیت (فَصَلِّ لِرَبِّكَ) میں جو نماز کا ذکر ہے، اس سے عید کی نماز مراد ہے اور (وَانْحَرْ) سے قربانی مراد ہے۔ مفسر قرآن شیخ ابوبکر جصاص^(۳) فرماتے ہیں کہ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: (۱) عید کی نماز واجب ہے۔ (۲) قربانی واجب ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو قربانی کی وسعت حاصل ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب نہ بھٹکے۔ (سنن ابن ماجہ۔ باب الاضاحی ہی واجبہ ام لا، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۱، السنن الکبریٰ ج ۹ ص ۲۶۰ کتاب الضحایا) وسعت کے باوجود قربانی نہ کرنے پر آپ ﷺ نے سخت وعید ارشاد فرمائی اور اس نوعیت کی سخت وعید واجب کے چھوڑنے پر ہی ہوتی ہے، لہذا معلوم ہوا کہ قربانی کرنا واجب ہے۔ (۳) حضرت جندب بن سفیان الجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں عید الاضحیٰ کے دن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے عید کی نماز سے پہلے (قربانی کا جانور) ذبح کر دیا تو اسے چاہیے کہ اس کی جگہ دوسری قربانی کرے اور جس نے (عید کی نماز سے پہلے) ذبح نہیں کیا تو اسے چاہیے کہ وہ (عید کی نماز کے) بعد ذبح کرے۔ (صحیح بخاری۔ باب من ذبح قبل الصلاة اعاد) حضور اکرم ﷺ نے عید الاضحیٰ کی نماز سے قبل جانور ذبح کرنے پر دوبارہ قربانی کرنے کا حکم دیا؛ حالانکہ اُس زمانہ میں صحابہ کرامؓ کے پاس مالی وسعت نہیں تھی۔ یہ قربانی کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔

قربانی کس پر واجب ہے:

ہر صاحب حیثیت کو قربانی کرنی چاہیے جیسا کہ حدیث میں گزرا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو قربانی کی وسعت حاصل ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے۔ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ قربانی کے وجوب کے لیے صاحب

وسعت ہونا ضروری ہے؛ البتہ مسافر پر قربانی واجب نہیں، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسافر پر قربانی واجب نہیں۔ (الحلی بالآثار لابن حزم ج ۶ ص ۳۷)

قربانی کے جانور:

بھیڑ، بکری، گائے، بھینس اور اونٹ (نر و مادہ) قربانی کے لیے ذبح کیے جاسکتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آٹھ جانور ہیں دو بھینسوں میں سے اور دو بکریوں میں سے، دو اونٹوں میں سے اور دو گائیوں میں سے۔ (سورۃ الانعام ۱۴۳ و ۱۴۴)

قربانی کے جانوروں میں بھینس بھی داخل ہے؛ کیونکہ یہ بھی گائے کی ایک قسم ہے، لہذا بھینس کی قربانی بھی جائز ہے۔ امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ بھینس کا حکم گائے والا ہے۔ (کتاب الاجماع لابن منذر ص ۳۷) حضرت حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں کہ بھینس گائے کے درجہ میں ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۶۵) حضرت امام سفیان ثوریؒ (متوفی ۱۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ بھینسوں کو گائے کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ (مصنف عبد الرزاق ج ۴ ص ۲۳) حضرت امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں کہ بھینس گائے ہی ہے (یعنی گائے کے حکم میں ہے) (موطأ مالک باب ماجاء فی صدقۃ الفطر) ہندوپاک کے جمہور علماء کی بھی یہی رائے ہے کہ بھینس گائے کے حکم میں ہے۔ سعودی عرب کے مشہور عالم شیخ محمد بن عثیمینؒ نے بھی بھینس کو گائے کے حکم میں شامل کیا ہے۔ بھینس عربوں میں نہیں پائی جاتی ہے؛ اس لیے اس کا ذکر قرآن کریم میں وضاحت سے نہیں ہے۔ (مجموع فتاویٰ و رسائل شیخ ابن عثیمینؒ ۳۴/ ۲۵) موسوعہ فقہیہ کویتہ میں میں یہی مذکور ہے کہ بھینس گائے کے حکم میں ہے۔

جانور کی عمر:

قربانی کے جانوروں میں بھینس اور بکری ایک سال، گائے اور بھینس دو سال اور اونٹ پانچ سال کا ہونا ضروری ہے؛ البتہ وہ بھینس اور دنبہ جو دیکھنے میں ایک سال کا لگتا ہو اس کی قربانی بھی جائز ہے۔

قربانی کے جانور میں شرکاء کی تعداد:

اگر قربانی کا جانور بکرا، بکری، بھینس یا دنبہ ہے تو وہ صرف ایک آدمی کی طرف سے کفایت کرتی ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بکری ایک آدمی کی طرف سے ہوتی ہے۔ (اعلاء السنن - باب ان البدن عن سبعة)

اگر قربانی کا جانور اونٹ، گائے یا بھینس ہے تو اس میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے ساتھ حج کا احرام باندھ کر نکلے تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں سات سات (آدمی) شریک ہو جائیں۔ (صحیح مسلم۔ باب جواز الاشتراک الخ.) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ والے سال حضور اکرم ﷺ کے ساتھ قربانی کی؛ چنانچہ اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے اور گائے بھی سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کی۔ (صحیح مسلم۔ باب جواز الاشتراک الخ.)

وضاحت: حجۃ الوداع اور صلح حدیبیہ کے موقع پر اونٹ اور گائے میں سات سات آدمی شریک ہوئے تھے، اس پر قیاس کر کے علماء امت نے فرمایا ہے کہ عید الاضحیٰ کی قربانی میں بھی اونٹ اور گائے میں سات سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔

قربانی کے ایام: قربانی کے تین ایام ہیں ۱۰ اور ۱۱ اذی الحجہ۔

✽ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قرآن کی آیت (وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایام معلومات سے مراد یوم النحر (۱۰ اذی الحجہ) اور اس کے بعد دو دن ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم الرازی ج ۶ ص ۲۶۱)

✽ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص قربانی کرے تو تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں قربانی کے گوشت میں سے کچھ نہیں بچنا چاہیے۔ (صحیح بخاری۔ باب ما یؤکل من لحوم الاضاحی) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے دن تین ہی ہیں؛ اس لیے کہ جب چوتھے دن قربانی کا بچا ہوا گوشت رکھنے کی اجازت نہیں تو پورا جانور قربان کرنے کی اجازت کہاں سے ہوگی؟

وضاحت: تین دن کے بعد قربانی کا گوشت رکھنے کی ممانعت ابتداء اسلام میں تھی بعد میں اجازت دے دی گئی کہ اسے تین دن بعد بھی رکھا جاسکتا ہے۔ (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۲۵۹) اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب تین دن کے بعد گوشت رکھنے کی اجازت مل گئی تو تین دن کے بعد قربانی بھی کی جاسکتی ہے، اس لیے کہ گوشت تو پورے سال بھی رکھا جاسکتا ہے تو کیا قربانی کی اجازت بھی پورے سال ہوگی؟ ہر گز نہیں۔ تین دن کے بعد قربانی کی اجازت نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔

✽ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ قربانی کے دن تین ہی ہیں۔ (موطا مالک۔ کتاب الضحایا)

✽ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن ۱۰ ذی الحجہ اور اس کے بعد کے دو دن ہیں؛ البتہ یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانی کرنا افضل ہے۔ (احکام القرآن للطحاوی ج ۲ ص ۲۰۵)

وضاحت: بعض علماء کرام نے مسند احمد میں وارد حدیث (كُلُّ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ ذَبْحٌ) کی بنیاد پر فرمایا کہ اگر کوئی شخص ۱۲ ذی الحجہ تک قربانی نہیں کر سکا تو ۱۳ ذی الحجہ کو بھی قربانی کی جاسکتی ہے؛ لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں فرمایا ہے کہ قربانی صرف تین دن کی جاسکتی ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے خود اپنی کتاب میں وارد حدیث کے متعلق وضاحت کر دی ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے تحریر کیا ہے کہ متعدد صحابہؓ کرامؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی بھی یہی رائے تھی۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قربانی کو صرف تین دن تک محدود رکھا جائے؛ کیونکہ حضور اکرم ﷺ یا کسی ایک صحابی سے ۱۳ ذی الحجہ کو قربانی کرنا ثابت نہیں ہے۔

قربانی کرنے والا ناخن اور بال نہ کاٹے:

✽ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہو جائے اور تم میں سے جو قربانی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ (مسلم) اس حدیث اور دیگر احادیث کی روشنی میں قربانی کرنے والوں کے لیے مستحب ہے کہ ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد قربانی کرنے تک جسم کے کسی حصے کے بال اور ناخن نہ کاٹیں۔ لہذا اگر بال یا ناخن وغیرہ کاٹنے کی ضرورت ہو تو ذی القعدہ کے آخر میں فارغ ہو جائیں۔



اسلام کا مشاورتی نظام

اہمیت اور طریقہ کار

از: مفتی تنظیم عالم قاسمی

استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

انسان کو زندگی میں بیشتر ایسے امور پیش آتے ہیں جن میں وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ کرنے اور نہ کرنے دونوں پہلوؤں پر اس کی نظر ہوتی ہے، وہ سردست یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ موجودہ حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ کام کے کس رخ کو اختیار کرنے میں اس کے لیے بھلائی اور ہدایت ہے؟ کشمکش کی اس صورت حال میں شریعت نے ہدایت دی ہے کہ ایسے تمام مواقع پر از خود فیصلہ کرنے اور اپنی عقل و دانش پر اعتماد کرنے کے بجائے متعلقہ کام کے ماہرین فن، ارباب نظر اور ہمدرد وہی خواہ افراد سے رائے معلوم کر لی جائے، پھر باہمی غور و فکر کے بعد جس جانب دل مائل ہو، اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اختیار کر لے، اس کو ”مشورہ یا مشاورت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صالح، کامیاب اور پر امن زندگی گزارنے کے لیے مشاورتی نظام اپنانا از حد ضروری ہے، بلاشبہ مشورہ خیر و برکت، عروج و ترقی اور نزولِ رحمت کا ذریعہ ہے، اس میں نقصان و شرمندگی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَا شَقِيَّ عَبْدٌ بِمَشْوَرَةٍ وَمَا سَعَدَ بِاسْتِغْنَاءٍ رَأْيٍ یعنی کوئی انسان مشورہ سے کبھی ناکام اور نامراد نہیں ہوتا اور نہ ہی مشورہ ترک کر کے کبھی کوئی بھلائی حاصل کر سکتا ہے۔ (قرطبی ۱۶۱/۴)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ ”جس نے استخارہ کیا وہ ناکام نہیں ہوا اور جس نے مشورہ کیا وہ شرمندہ نہ ہوا“ (الحجۃ الاوسط للطبرانی ۶۸۱۶)

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: الْمَشُورَةُ حِصْنٌ مِنَ النَّدَامَةِ وَ أَمِنْ مِنَ الْمَلَامَةِ، مشورہ شرمندگی سے بچاؤ کا قلعہ ہے اور ملامت سے مامون رہنے کا ذریعہ ہے۔“
(ادب الدین والدین ۱/ ۲۷۷)

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک انسان جب اپنی رائے پر عمل کرتے ہوئے کوئی کام کرتا ہے اگر اس میں ناکامی ہو جائے تو بہت سی زبانیں لعن طعن کرنے لگتی ہیں، ملامت کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے اور پھر بڑی ذلت محسوس ہوتی ہے؛ لیکن اگر مشورہ کے بعد کوئی کام کیا جائے تو عام طور پر اس میں ناکامی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ مشورہ کی برکت سے خیر کی راہیں کھول دیتا ہے اور اگر فیصلہ تقدیر کے سبب مشورہ کے تحت کیا ہوا کام بار آور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکا تو بھی اس میں لوگوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی نہیں پڑتی؛ اس لیے کہ اس میں صرف اسی کی عقل و فکر شامل نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ارباب نظر اور ماہرین فن کی رائیں اور عقلیں شامل ہیں، ملامت کس کس کو کی جائے اور ملامت کرنے والا بھی اپنی اصابت رائے کی ضمانت نہیں دے سکتا؛ اس لیے مشورہ میں دیگر اہم فائدوں کے ساتھ ایک بڑا فائدہ ملامت اور طعن و تشنیع سے نجات بھی بتایا گیا ہے، ایک شاعر مشورہ کی اسی افادیت کے پیش نظر کہتا ہے:

الرَّأْيُ كَاللَّيْلِ مُسَوِّدٌ جَوَانِبُهُ ☆ وَاللَّيْلُ لَا يَنْجَلِي إِلَّا بِالصُّبْحِ
فَاضْمُمْ مَصَابِيحَ آرَاءِ الرِّجَالِ إِلَى ☆ مَصْبَاحِ رَأْيِكَ تَزْدَدُ وُضُوءَ مَصْبَاحِ
”رائے تاریک رات کی طرح ہے کہ اس کے اطراف سیاہ ہیں اور رات کا اندھیرا بغیر صبح کے زائل نہیں ہوتا، لوگوں کی رائے کی مشعل کو اپنے چراغ کے ساتھ ملا لینے سے تیرے چراغ کی روشنی زیادہ ہو جائے گی،“ یعنی آدمی اپنی رائے سے ایک پہلو کو سمجھتا ہے؛ مگر جیسا کہ رات میں اگرچہ قریب کی چیز کا احساس و ادراک ہو جاتا ہے؛ مگر ذرا فاصلہ کی چیز نظر نہیں آتی، اسی طرح تنہا اپنی رائے سے تمام پہلو روشن نہیں ہوتے، وہ برابر معرض خفاء میں رہتے ہیں؛ لیکن جب صبح ہو کر شب کی تاریکی زائل ہو جاتی ہے تو مشرق و مغرب، جنوب و شمال کی تمام چیزیں روشن ہو جاتی ہیں، اسی طرح جب اپنی رائے کے ساتھ دوسروں کی رائے کو ملا لیا گیا تو گویا ایک چراغ کے ساتھ جس کی روشنی تھوڑی دور تک پھیلی ہوئی تھی، ہزاروں شمعوں کو روشن کر دیا اور عالم کے نورانی ہو جانے سے خود اس کے چراغ کی روشنی بھی بڑھ گئی اور اطراف و جوانب کی سب چھوٹی بڑی چیزیں ظاہر و نمودار ہو گئیں۔

بعض بلغاء کا قول ہے:

مِنْ حَقِّ الْعَاقِلِ أَنْ يُضَيَّفَ إِلَى رَأْيِهِ آرَاءَ الْعُقَلَاءِ، يَجْمَعُ إِلَى عَقْلِهِ عُقُولَ الْحُكَمَاءِ فَإِنَّ الرَّأْيَ الْفَدَّ رُبَّمَا ذَلٌّ وَالْعَقْلَ الْفَرْدَ رُبَّمَا ضَلٌّ ”عاقِل کا فرض یہ ہے کہ اپنی رائے کے ساتھ عقلاء کی رائے کا اضافہ کرے اور اپنی عقل کے ساتھ حکماء کی عقل کو جمع کرے؛ کیوں کہ اکیلی رائے بسا اوقات ذلیل ہوتی ہے اور پھسل جاتی ہے اور تنہا عقل بسا اوقات گمراہ ہو جاتی ہے۔“ ظاہر ہے کہ اپنی عقل کے ساتھ جب دیگر عقلوں اور اپنے تجربہ کے ساتھ دیگر تجربات کو ملایا جائے تو اس میں استحکام پیدا ہوگا اور غلطی کا امکان کم ہو جائے گا، خواہ وہ عقلیں اپنے تئیں ناقص ہی کیوں نہ ہوں؛ چوں کہ مشورہ میں شریک افراد بڑی مشقتوں سے حاصل کیے ہوئے تجربات کی روشنی میں رائے دیتے ہیں؛ اس لیے مشورہ کرنے والے کو اہم اور قیمتی باتیں مفت مل جاتی ہیں جن کو اگر وہ خود حاصل کرنا چاہے تو زندگی ختم کر کے بھی حاصل ہونا یقینی نہیں ہے؛ اسی لیے حکیم لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: تجربہ کا تجھ کو وہ رائے دیتا ہے جو اس کو نہایت گراں قیمت پر ملی ہے یعنی نہایت مشقت و تحمل مصائب کے بعد حاصل ہوئی ہے اور تو اس کو مفت بلا تعب اڑاتا ہے۔ (اسلام میں مشورہ کی اہمیت از مفتی محمد شفیعؒ ۶۱ تا ۶۳)

حضرت علیؓ کا یہ قول بھی کتنا جامع ہے: اَلْاِسْتِشَارَةُ عَيْنُ الْهُدَايَةِ وَ قَدْ خَاطَرَ مَنْ اسْتَعْنَى بِرَأْيِهِ. (المدخل ۴/۲۸) مشورہ عین ہدایت ہے اور جو شخص اپنی رائے سے ہی خوش ہو گیا وہ خطرات سے دوچار ہوا۔ خلاصہ یہ کہ مشورہ ایک مہتم بالشان امر ہے، رشد و ہدایت اور خیر و صلاح اس سے وابستہ ہے؛ جب تک مشورہ کا نظام باقی رہے گا، فساد اور ضلالت و گمراہی راہ نہیں پاسکے گی، امن اور سکون کا ماحول رہے گا، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمہارے مالدار سخی ہوں اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لیے بہتر ہے اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔“ (روح المعانی: ۵۳۱/۷)

دنیا کے حالات پر جن کی نظر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ دنیا میں جتنے بھی دینی و ملی ادارے چل رہے ہیں، ان میں جن کا نظام مشورہ سے مربوط ہے، ان کے تمام امور مستحکم اور پائیدار ہیں اور وہ تمام داخلی و خارجی فتنے و فساد سے پاک ہیں؛ لیکن جب کسی ادارے یا حکومت کو

خاندانی یا ورثاتی نظام پر چلایا جاتا ہے کہ پہلے باپ حکمران تھا تو محض اس بنیاد پر بیٹا اس کا اہل قرار پائے اور یہی سلسلہ چلتا رہے تو پھر یاد رکھنی چاہیے کہ یہ حکومت دیر پا نہیں ہوتی، ہزار طرح کے مسائل وہاں جنم لیتے ہیں اور ایک دن پورا شہر فتنہ و فساد کے لپیٹ میں آ جاتا ہے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں حکمرانی کا یہی طریقہ رائج تھا، اسی وجہ سے وہاں ہر گھر، ہر خاندان، ہر قبیلہ الگ الگ خانوں میں منقسم ہو گیا تھا فتنہ و فساد کا ایک سیلاب تھا، جس پر کوئی بندش نہیں تھی، لوگوں کو کسی گرفت کا احساس نہیں تھا؛ اس لیے جو شخص جو چاہتا کرتا تھا اور پھر یہیں سے زنا کاری، شراب نوشی، ڈاکہ زنی، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری، جیسے ہزاروں جرائم وجود میں آئے اسلام نے اس طریقہ کو مٹا کر مشاورتی نظام قائم کیا، مختلف نوعیتوں سے مشورہ کی اہمیت بیان کی گئی؛ بلکہ اس کو مسلمانوں کا وصف خاص قرار دیا گیا۔ ارشاد باری ہے: **وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ**۔ (شوریٰ: ۳۸) ”ایمان والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم کو مانا، نماز قائم کی اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اسے خرچ کرتے ہیں۔“ اس آیت میں مسلمانوں کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک وصف باہمی مشورہ بھی ہے یعنی کسی اہم معاملہ کو آپسی رایوں کے ذریعہ حل کیا جانا کامل اور پختہ ایمان مسلمانوں کی صفت ہے، اطاعتِ خداوندی اور اقامتِ صلوٰۃ کے بعد فوری طور پر مشورہ کے معاملہ کو بیان کرنے سے اس کی غیر معمولی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور بالخصوص خلفاء راشدینؓ نے مشورہ کو اپنا معمول بنایا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا حکم دیا تھا ارشاد ہے: **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ**۔ “(ال عمران: ۱۰۹) اے نبی! آپ معاملات اور متفرق امور میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا کیجیے۔“ بظاہر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کی حاجت نہیں تھی؛ کیوں کہ آپ کے لیے وحی کا دروازہ کھلا ہوا تھا، آپ چاہتے تو وحی کے ذریعہ معلوم ہو سکتا تھا کہ کیا اور کس طرح کرنا چاہیے؟ اسی لیے مفسرین کرام نے یہاں بحث کی ہے کہ حکم مشورہ سے کیا مراد ہے۔ حضرت قتادہ، ربیع اور دوسرے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اطمینانِ قلب اور ان کو وقار بخشنے کے لیے یہ حکم دیا گیا تھا؛ اس لیے کہ عرب میں مشورہ اور رائے طلبی باعثِ عزت و افتخار تھا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں: **فَقَالَتْ طَائِفَةٌ ذَلِكَ فِي مَكَائِدِ الْحُرُوبِ وَ عِنْدَ لِقَاءِ الْعُدُوِّ وَ تَطْيِيبًا لِنَفْسِهِمْ وَ رَفْعًا لِأَقْدَارِهِمْ وَ جَأْلًا عَلَىٰ دِينِهِمْ** (قرطبی ۱۶۱/۴)

حقیقت یہ ہے کہ وحی کے ذریعہ اگرچہ بہت سے امور میں آپ کی رہنمائی کر دی جاتی تھی؛ مگر بعض حکمت اور مصالح کے پیش نظر چند امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا، ان ہی مواقع میں آپ کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ کا حکم دیا گیا؛ تاکہ امت میں مشورہ کی سنت جاری ہو سکے اور لوگ یہ سمجھیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل فہم و بصیرت ہونے کے باوجود مشورہ کا حکم دیا گیا تو پھر ہم اس کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہیں؛ چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

أَمَّا إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَغَنِيَّا عَنْهَا وَلَكِنْ جَعَلَهَا اللَّهُ تَعَالَى رَحْمَةً لِّأُمَّتِي (الدر المنثور: ۳۵۹/۴) یعنی یاد رکھو! کہ اللہ اور اس کے رسول مشورہ سے بالکل مستغنی ہیں؛ لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو امت کے لیے رحمت کا سبب بنایا ہے۔ وَ إِنَّمَا أَرَادَ أَنْ يُعَلِّمَهُمْ مَا فِي الْمَشَاوِرَةِ مِنَ الْفَضْلِ وَلِنَقْتَدِيَ بِهِ أُمَّةٌ مِّنْ بَعْدِهِ ”اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعہ مسلمانوں کو مشورہ کی فضیلت کا سبق سکھانے کا ارادہ کیا ہے؛ تاکہ آپؐ کے بعد آپ کی امت اس کی پیروی کریں“ (قرطبی ۱۶۱/۲)

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا کسی کو نہیں پایا یعنی آپؐ ہر قابل غور معاملہ میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کر کے ہی کوئی فیصلہ فرماتے، مثلاً: بدر کی لڑائی سے فراغت ہو چکی تو آپؐ نے اسیرانِ جنگ بدر کے بارے میں صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ ان کو مواضع لے کر رہا کر دیا جائے یا قتل کیا جائے یا، مثلاً: غزوہٴ اُحد کے بارے میں مشورہ کیا کہ کیا مدینہ شہر کے اندر رہ کر مدافعت کی جائے یا شہر سے باہر نکل کر۔ عام طور سے صحابہ کرامؓ کی رائے باہر نکلنے کی ہوئی تو آپؐ نے اس کو قبول فرمایا۔ غزوہٴ خندق میں ایک خاص معاہدہ پر صلح کرنے کا معاملہ درپیش ہوا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ کو مناسب نہیں سمجھا؛ اس لیے ان دونوں نے اختلاف کیا آپؐ نے ان دونوں کی رائے قبول کر لی، حدیبیہ کے ایک معاملہ میں مشورہ لیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر فیصلہ فرمادیا، قصۂ اُفک میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا، اسی طرح اذان کی بابت بھی اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ نماز کی اطلاع دینے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی حکمت کی بنا پر کسی خاص جانب رہنمائی نہ کی جاتی، ان میں صحابہ کرامؓ سے آپؐ مشورہ فرماتے، اس میں ان لوگوں کے لیے جو مشورہ کو کھیل اور لغو کام سمجھتے

ہیں یا جن کو مشورہ لینے میں عار اور خفت محسوس ہوتی ہے؛ حالانکہ مشورہ طلب کرنے میں ہی عزت ہے، مشورہ کرنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا، اگر کامیاب ہو جائے تو اس کی مدح کی جاتی ہے اور اگر مشورہ کے بعد بھی کامیابی نہ ملی تو اسے معذور سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر مشورہ کیے بغیر کوئی کام کیا گیا اور کام نہیں بن سکا تو پھر اس کی ذلت ہی ذلت ہے، ہزار لوگ اس کو طعن و تشنیع کریں گے اور مختلف باتیں اس کو سننے کے لیے اس کو تیار رہنا ہوگا۔

تخلیق آدم علیہ السلام کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور ان کی رائے معلوم کی تھی جس کی تفصیل (سورہ بقرہ آیت ۳۰) کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے، اس سے درحقیقت فرشتوں سے مشورہ طلب کرنا مقصد نہیں تھا؛ بلکہ انسانوں کے دل و دماغ میں مشورہ کی اہمیت پیدا کرنا مقصد تھا کہ خالق کائنات کے اس عمل کو پوری کائنات میں طریقہ بنایا جائے؛ مگر افسوس! کہ آج دیگر اعمال خیر کی طرح مشورہ کی سنت بھی ہماری زندگی اور معاشرہ سے رخصت ہو گئی جس کے بھیا نک نتائج ہمارے سامنے ہیں، ساری محنتوں مشقتوں اور کوششوں کے باوجود نا کامی ہمارے حصہ میں ہے، ہر طرف انفرادی اور اجتماعی جگہوں میں خلفشار اور انتشار پایا جاتا ہے بسا اوقات نا کامی اور نقصان کے بعد مشورہ نہ کرنے پر افسوس بھی ہوتا ہے؛ مگر اب کیا حاصل؟ ضرورت ہے کہ اہم اور قابل غور مسائل میں کام کے آغاز سے پہلے ہی مشورہ کو اپنا معمول بنایا جائے؛ تاکہ محنتیں بار آور اور نتیجہ خیز ثابت ہوں، یقیناً مشورہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بھی ہے اور ہزار دینی و دنیوی فائدے بھی، کاش! امت مسلمہ کی زندگی اور معاشرہ میں مشورہ کی سنت جاری ہو جائے۔

مشورہ کے امور

لیکن اب سوال یہ ہے کہ مشورہ کہاں اور کن چیزوں میں کیا جائے؟ اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ جن امور میں شریعت کا فیصلہ متعین ہے کہ یہ چیز فرض ہے یا واجب ہے یا حرام یا مکروہ ہے، ان امور میں مشورہ کی ضرورت نہیں؛ بلکہ جائز بھی نہیں ہے، جیسے کوئی شخص یہ مشورہ کرے کہ نماز پڑھے یا نہیں، زکوٰۃ دے یا نہیں، حج کرے یا نہیں، یہ چیزیں مشورہ کی نہیں ہیں، ان کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم متعین ہے کہ ان کا کرنا ہر حال میں ضروری ہے یا اسی طرح جن چیزوں کو شریعت نے منع کیا ہے، جیسے زنا کاری، شراب نوشی، ڈاکہ زنی وغیرہ ان میں بھی مشورہ کی حاجت نہیں، ان سے تو بہر حال رکنا لازمی ہے؛ البتہ طریق کار کے بارے میں مشورہ کیا جاسکتا

ہے، جیسے حج میں جانے کے لیے مختلف راستے ہیں، بعض پُر امن ہیں اور بعض میں خطرہ ہے، تو اس موقع پر تجربہ کار افراد کی رائے معلوم کی جاسکتی ہے کہ ان مختلف راستوں میں اس کے لیے کون سا راستہ بہتر ہوگا، یا اسی طرح ایک شخص مریض ہے اس کو تردد ہے کہ مجھ کو اس حالت میں تیمم کی اجازت ہے یا نہیں، اس بارے میں اطباء یا تجربہ کاروں سے مشورہ کر سکتا ہے، اسی طرح وہ احکام و مسائل جن کے بارے میں قرآن و حدیث، اقوال صحابہؓ یا سلف کی کتابوں میں کوئی صراحت نہیں ہے، جدید اور نئے زمانہ سے ان کا تعلق ہے، ان میں مشورہ کرنا نہ صرف جائز؛ بلکہ ارباب فقہ اور صاحب نظر علمائے دین سے ان کے بارے میں پوچھنا اور حکم شرعی معلوم کرنا واجب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحت قرآن میں نازل نہیں ہوا اور آپ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لیے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار فقہاء کو جمع کرو اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔ (معارف القرآن ۲/۲۲۰)

دینی امور کے علاوہ معاشی، معاشرتی، سماجی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش آنے والے معاملات میں بھی مشورہ کو اپنانا چاہیے، جہاں شریعت، عقل و عادت کے اعتبار سے کوئی جانب متعین ہو اور نہ ہی اس کا نافع ہونا یقینی ہو، امور طبعیہ جیسے بھوک اور پیاس کے وقت روٹی کھانا یا پانی پینا، اس میں مشورہ کرنے اور کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے کھانا کھانا چاہیے یا نہیں؟ عام حالات میں یہ سوال حماقت ہے، ہاں بیماری کے وقت یا اس کے ذرائع اور طرق یا مختلف اغذیہ اور اثر یہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں اگر کسی کے اندر خطرہ کا احتمال ہو تو مشورہ کرنا مستحسن یا ضروری ہوگا۔ یہاں اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشورہ کی ترغیب اور ہدایت تو دی ہے؛ مگر اپنی رحمت عامہ کی بنا پر چند مخصوص جگہوں کے علاوہ انسان کو مقید نہیں کیا کہ کوئی معاملہ بلا مشورہ کر ہی نہ سکے، بسا اوقات اہم معاملات پیش آتے ہیں اور ایک تجربہ کار انسان کو اس کے انتظام و انصرام اور حل کا طریقہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کسی صاحب عقل و دانش سے مشورہ کرے گا تو اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں بتلا سکتا، اس حالت میں اگر وہ بلا مشورہ کام کر بیٹھے تو کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح معاملات کی نوعیت اور منافع و خطرات کی عظمت و وقعت اور قوت و ضعف کے اعتبار سے مشورہ کے حکم استحسان میں فرق ہو جائے

گا، بعض مواقع میں مشورہ نہایت اہم اور ضروری ہوگا اور بعض جگہ درجہ استفسان میں رہے گا۔ بہر حال وہ امور جن میں کوئی جانب شرعاً، عقلاً، عرفاً، عادتاً معین نہیں اور جن کے مختلف جوانب میں خطرات و منافع کا احتمال ہے، یعنی نتائج مبہم اور مخفی ہوں، ان میں مشورہ کو اپنا معمول بنانا چاہیے۔ اس میں اتباع سنت کے علاوہ ہزار فوائد ہیں، اہل علم اور مشورہ کے پابند حضرات اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مشورہ کن سے کیا جائے؟

مشورہ ہمیشہ ایسے شخص سے کرنا چاہیے جس کو متعلقہ معاملے میں پوری بصیرت اور تجربہ حاصل ہو؛ چنانچہ دینی معاملات میں ماہر اور صاحب نظر عالم دین سے مشورہ کرنا چاہیے اور کسی بیماری اور جسمانی صحت کے بارے میں کسی اچھے ڈاکٹر کا انتخاب ہی مفید ہوگا۔ غرض جس طرح کا معاملہ ہے، اسی فن کے ماہرین اور تجربہ کار کا انتخاب کیا جائے؛ کیوں کہ تجربہ کے بغیر صرف عقل کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتی، گویا مشورہ لینے کے لیے عقل اور تجربہ دونوں کا یک وقت موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر صحیح رہنمائی نہیں مل سکتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: **اِسْتَشِيْرُوا ذَوِي الْعُقُولِ تَرْشَلُوْا وَ لَا تَعْصُوْهُمْ فَنَنْدُمُوْا۔** (مسند شہاب: ۶۷۳) ”عقل مندوں سے مشورہ کرو، کامیابی ملے گی اور ان کی مخالفت نہ کرو ورنہ شرمندگی ہوگی۔“ حضرت عبداللہ بن الحسن نے اپنے صاحبزادہ محمد بن عبداللہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”جاہل کے مشورہ سے بچو اگرچہ کہ وہ خیر خواہ ہو جیسا کہ عقل مند کی دشمنی سے بچتے ہو۔“ (المدخل: ۲۹/۴)

کسی میں اگر عقل اور تجربہ نہیں ہے تو وہ مشورہ کا اہل بھی نہیں ہے، اگر اس سے مشورہ کیا جائے تو پہلے وہ مشورہ ہی کیا دے گا اور اگر مشورہ دے گا بھی تو اس مشورے سے کیا فائدہ؟ اس لیے مشورہ کے لیے عقل مند، ماہر اور تجربہ کار ہونے کی شرط لگائی گئی ہے۔ اسلام کی شورایت اور موجودہ جمہوریت میں یہی بڑا فرق ہے کہ شورایت کا تعلق اہلیت سے ہے اور جمہوریت کا اکثریت سے، جس پارٹی کو اکثر لوگوں نے منتخب کر لیا وہی حکمرانی کا حق دار ہے، چاہے ووٹ دینے والے پاگل اور دیوانہ ہی کیوں نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ جمہوری نظام ایک تباہ کن نظام ہے، عقل و خرد سے اس نظام کا کوئی واسطہ نہیں ہے، اسلام نے اپنا نظام شورایت پر رکھا ہے، یعنی ماہرین، تجربہ کار اور عقل مندوں کے مشورے سے کوئی فیصلہ صادر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم، حضرات شیخین، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو جمہور صحابہؓ پر فوقیت دیتے اور آپؐ ان دونوں حضرات سے مخاطب ہو کر فرماتے: **لَوْ اجْتَمَعَتْهُمَا فِي مَشُورَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا**۔ ”جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا۔“ (مسند احمد) معلوم ہوا کہ محض کثرت کا شریعت اسلامی میں کوئی اعتبار نہیں، قوت عقل و بصیرت اہم چیز ہے۔

اسی طرح مشورہ کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو متقی اور دیندار ہو، جس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور عند اللہ جواب دہی کا احساس نہ ہو، اس کے مشورہ پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، پتہ نہیں اس نے صحیح مشورہ دیا ہے یا نہیں، ممکن ہے کہ اس کے نزدیک دوسری رائے بہتر ہو اور محض نقصان پہنچانے کے لیے اس کو یہ رائے دی ہو؛ تاکہ مشورہ کرنے والے کو نقصان اور پریشانی میں دیکھ کر ہنسنے اور مذاق کا موقع مل سکے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پرانے زمانے کا کوئی بغض دل میں چھپا ہوتا ہے اور وہ موقع کی تاک میں رہتا ہے، غلط مشورہ دے کر نقصان پہنچانے میں وہی بدلے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے؛ لیکن جب آدمی میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوگا تو اس طرح کے احتمالات اور امکان سے دل مطمئن ہوگا، اسی لیے اہل علم نے لکھا ہے کہ مشورہ دینے والے کو دیکھنا چاہیے کہ اس میں ہمدردی کا جذبہ ہے یا نہیں، اگر ہمدردی کا داعیہ نہیں بالخصوص مشورہ لینے والے کے حق میں مشیر کا دل حسد و کینہ اور بدخواہی سے پُر ہو تو اس سے مشورہ ہرگز نہیں لینا چاہیے، اس کا مشورہ سم قاتل سے کم نہیں ہوگا۔

مشورہ لینے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مشیر فکر و نظر کے اعتبار سے صالح ہے یا نہیں، جذباتی انسان کا مشورہ معتبر نہیں ہو سکتا ہے؛ اس لیے کہ ایسے شخص کا مشورہ اس امکان سے خالی نہیں کہ غیظ و غضب میں مبتلا ہو کر یا جذبات کے رَو میں بہہ کر اس نے یہ رائے دی ہو، اسی طرح جس کا قلب ایسے بھوم و افکار سے خالی نہ ہو جن کی وجہ سے دماغ پریشان اور قلب مشغول ہو جاتا ہے، ان سے بھی مشورہ طلب نہیں کرنا چاہیے؛ اس لیے کہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی پوری عقل لڑا کر اس کی تمام جہتوں پر غور کر سکتا ہے اور نہ ہی مستشیر کی رہبری کر سکتا ہے۔

جس کا مفاد وابستہ ہو اس سے بھی مشورہ نہ کیا جائے، جیسے کسی دکاندار سے کسی چیز کے خریدنے کے بارے میں اگر پوچھا جائے گا تو وہ اس کی بہت ساری خوبیاں بیان کر دے گا؛ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس سامان کے فروخت ہونے میں اس کے منافع پوشیدہ ہیں؛ اس لیے اس سامان کے کمزور پہلوؤں کو وہ پردہ راز میں رکھتا ہے۔ مشورہ لینے والے کو چاہیے کہ سوچ سمجھ کر

مشیر کا انتخاب کرے، ورنہ مشورہ سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا سکتا ہے۔

مشیر کے فرائض

(۱) جس معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جا رہا ہے، اگر اس میں مکمل بصیرت ہو تو مشورہ دے، ورنہ صاف کہہ دے کہ مجھے اس بارے میں کوئی جانکاری نہیں ہے؛ اس لیے میں مشورہ کا اہل نہیں ہوں، یہ کوئی ہتک اور بے عزتی کی بات نہیں؛ بلکہ اس کے اخلاص اور جذبہ ہمدردی کی بنیاد پر اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، مشورہ لینے والے کا بھی اعتماد بڑھ جائے گا اور اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ میرے حق میں مخلص ہے، آج کل لوگوں کا یہ مزاج ہے کہ کچھ آئے یا نہ آئے مشورہ لیتے وقت ضرور کچھ نہ کچھ جواب اور مشورہ دے دیتے ہیں، یہ دیانت کے خلاف ہے۔

(۲) غور و فکر کے بعد مشیر کا ذہن جس طرف مائل ہو رہا ہے، کسی رعایت کے بغیر صاف طور پر اس کا اظہار کر دے، یعنی مشیر کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ اسے اپنے بھائی کا حق سمجھتے ہوئے صحیح مشورہ دے، رسول اکرم ﷺ نے جان بوجھ کر کسی کے معاملہ کو بگاڑنے کے لیے یا کسی کا نقصان کرانے کے لیے مشورہ دینے کو خیانت اور گناہ قرار دیا ہے ارشاد ہے: ”مَنِ اسْتَشَارَ اَخَاهُ فَاَشَارَهُ عَلَيْهِ بِاَمْرٍ وَهُوَ يَرَى الرُّشْدَ غَيْرَ ذَلِكَ فَقَدْ خَانَ“ (مسند احمد) ”جس نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا اور اس نے اسے کوئی ایسا مشورہ دیا جس کے علاوہ میں وہ کامیابی سمجھتا ہو تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔“ مشورہ دینے میں اس بات کی ہرگز پرواہ نہ کرے کہ اگر میں اس کو یہ مشورہ دوں گا تو شاید اس کا دل ٹوٹ جائے گا، یہ مجھ سے ناراض اور رنجیدہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ مشورہ طلب کرنے کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ خوش کرنے کے لیے غلط اور خلاف حقیقت رائے دی جائے، کسی انسان کی نہیں؛ بلکہ اللہ کی رضا مندی اور ناراضگی کا خیال رکھے اور جو مشورہ ذہن میں آئے دو لوگ انداز میں بیان کر دے۔ اس کے ذیل میں علماء اور فقہاء نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ صحیح مشورہ دینے میں اگر کسی کی غیبت بھی ہو رہی ہو تو بھی صحیح بات بتائے، شرعاً ان مواقع میں غیبت معاف ہے۔ مثلاً رشتہ کے لیے کسی لڑکی یا لڑکے کے بارے میں سوال کیا جائے، اگر اس میں کوئی عیب ہے اور آپ کو معلوم ہے تو مشورہ لینے والے کو ضرور مطلع کر دینا چاہیے اور اس موقع پر اظہارِ عیب معاف ہے؛ کیوں کہ یہاں کسی کی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا مسئلہ ہے۔

(۳) مشورہ دینے والے کی ذمہ داری ہے کہ جس معاملہ میں مشورہ لیا گیا ہے، اس کو راز

میں رکھے، لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر نہ کرے، جیسے کسی نے اپنی بیوی کے کسی معاملہ کے بارے میں مشورہ کیا یا لڑکی اور لڑکے کے رشتہ یا کسی اور معاملہ میں رائے معلوم کی تو گویا یہ مشیر اور مستشار کے درمیان ایک راز کی بات ہوگی، ہو سکتا ہے کہ مشورہ لینے والا چاہتا ہو کہ اس کی یہ باتیں مشیر کے علاوہ دوسروں تک نہ پہنچے، دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے یقیناً اس کو تکلیف پہنچے گی اور یہ خیانت کا معاملہ ہوگا، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ“ (ترمذی) یعنی جس شخص سے مشورہ کیا جاتا ہے وہ امانت دار ہوتا ہے، اسے امانت داری کا پورا حق ادا کرنا چاہیے۔ آج کل دیگر خرابیوں کے ساتھ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ کسی کے راز کو راز نہیں سمجھا جاتا، کسی کے بارے میں کوئی چیز معلوم ہوتی ہے تو فوراً اسے عام کرنے کی فکر ہو جاتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں جھگڑے، فسادات و دشمنیاں اور ناچاقیاں پھیلتی ہیں، ضرورت ہے کہ دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کیا جائے اور اتحاد و یگانگت کا ماحول بنایا جائے۔

(۴) مشیر کا کام ہے صرف مشورہ دینا، اصرار یا رائے تھوپنے کا مزاج درست نہیں ہے، مشورہ لینے والے کا مقصد ہوتا ہے کہ مختلف جہتوں سے معاملہ کو پہچانا اور جانا جائے پھر غور و فکر کے بعد کسی ایک پہلو کو اختیار کیا جائے، ظاہر ہے کہ مشورہ طلب کرنے والا مشورہ میں شریک تمام افراد کی رایوں اور خیالات پر عمل نہیں کر سکتا، وہ صرف اپنے ذاتی حالات کے اعتبار سے صرف کسی ایک کی رائے کو پسند کر سکتا ہے؛ اس لیے اگر کسی کے مشورہ پر عمل نہ کیا جائے تو اس سے دل گیر اور رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے، خوش دلی اور خندہ پیشانی سے مشورہ کرنے والے کے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار کیا جائے، حضرت بریرہؓ کا نکاح حضرت مغیثؓ سے ہوا تھا، حضرت بریرہؓ پہلے باندی تھیں، جب وہ آزاد کی گئیں تو رسول اکرم ﷺ نے شریعت کا حکم سنایا کہ تمہیں اختیار ہے چاہو تو اپنے شوہر کے نکاح میں رہو اور چاہو تو علاحدگی اختیار کر لو، حضرت بریرہؓ شوہر سے خوش نہیں تھیں؛ اس لیے انہوں نے علاحدگی کا ارادہ کر لیا، ان کے شوہر حضرت مغیثؓ کو ان سے کافی محبت تھی، وہ چاہتے تھے کہ بریرہؓ علاحدگی اختیار نہ کریں، حضرت مغیثؓ نے بہت کوشش کی؛ مگر وہ تیار نہ ہوئیں، بالآخر نبی کریم ﷺ سے حضرت مغیثؓ نے سفارش کرائی، حضرت بریرہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ آپ کا مشورہ ہے یا حکم ہے؟ اگر حکم ہے تو سرتابی کی مجھے جرأت نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حکم نہیں مشورہ ہے، حضرت بریرہؓ نے عرض کیا پھر تو میں آزاد ہوں کہ اس مشورہ کو قبول کروں یا نہ کروں، میری زندگی ان کے ساتھ گزرنی مشکل ہے؛ اس لیے میں ان سے علاحدگی اختیار کرتی ہوں آپ

نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ (مشکوٰۃ: ۲۷۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صائب الرائے کون ہو سکتا ہے؛ لیکن چوں کہ مشورہ تھا؛ اس لیے حضرت بریرہؓ کے نہ ماننے پر آپؐ نے کسی طرح ناراضگی ظاہر نہیں کی، موجودہ دور کے لیے یہ حدیث بڑی سبق آموز ہے، ذاتی رائے کو عام لوگوں پر مسلط کرنے کا مزاج عام ہو گیا ہے، جس کے سبب بد نظمی اور بد عنوانی کا ہر طرف ایک سیلاب ہے۔ اپنی رائے کو محض ایک معمولی رائے سمجھنا چاہیے، نہ کہ قولی فیصلہ؛ تاکہ مشورہ کا حقیقی فائدہ حاصل ہو سکے۔

مشورہ میں عمر کی قید نہیں

ہر وہ شخص جس میں مشورہ کی اہلیت پائی جاتی ہو، یعنی عقلمند تجربہ کار اور متقی وغیرہ ہو تو اس سے مشورہ لیا جاسکتا ہے خواہ عمر کم ہو یا زیادہ، مشورہ کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، سیدنا حضرت عمر بن الخطابؓ بعض وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے، حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہ موجود ہوتے تھے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عمر، علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے، معلوم ہوا کہ چھوٹوں سے مشورہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اگر مشورہ کی اہلیت رکھنے والے ضابطے کے بڑے موجود نہ ہوں تو اپنے اہل و عیال جن پر اعتماد ہو ان سے کم سے کم مشورہ ضرور کر لینا چاہیے، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ غیب سے مشورہ کی برکت سے ضرور کوئی راستہ نکالے گا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کہ مسلمان عمرہ کرنے سے روک دیے گئے تھے، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اسی مقام پر احرام کھولنے کا حکم دیا، مگر صحابہ کرامؓ پس و پیش کر رہے تھے، آپ ﷺ نے امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہؓ سے مشورہ کیا، انہوں نے فرمایا: یا رسول اللہ! یہ حضرات صحابہ جذبات اور جوش کے عالم میں مغلوب ہیں، اس لیے ان کے طرزِ عمل کا کچھ خیال نہ کیجیے اور آپؐ خود پہلے اپنا احرام کھول لیجیے، یہ مشورہ کامیاب ہوا، صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی اتباع میں احرام کھول دیا۔ حضرت امّ سلمہؓ آپؐ سے عمر میں چھوٹی اور بیوی تھیں پھر بھی ضرورت پڑنے پر آپؐ نے ان سے مشورہ کیا۔

اگر مشورہ میں اختلاف ہو جائے

کچھ لوگ اپنی عقل و دانش اور تجربہ و فن کے اعتبار سے ایک کام کو بہتر سمجھتے ہوں اور مشورہ میں شریک دوسرے افراد اس کو بہتر نہیں سمجھتے ہوں یا اس طرح کا اور کوئی اختلاف ہو جائے تو وہاں دیکھنا چاہیے کہ کون سی رائے قرآن و سنت کے مطابق یا قریب تر ہے، اس پر عمل کر لیا جائے،

اقلیت یا اکثریت کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، افراد کی کمی اور زیادتی پر نظر نہ رکھی جائے، علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔ ”وَالشُّورَى مَبْنِيَّةٌ عَلَى اخْتِلَافِ الآرَاءِ وَالْمُسْتَشِيرُ يُنْظَرُ فِي ذَلِكَ الْخِلَافِ وَيُنْظَرُ أَقْرَبُهَا قَوْلًا إِلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ إِنْ أَمَكْنَهُ فَإِذَا أُرْشِدَهُ اللَّهُ تَعَالَى إِلَى مَا شَاءَ مِنْهُ عَزَمَ عَلَيْهِ.“ (قرطبی: ۴/ ۱۶۲)

مانگے بغیر مشورہ دینا

مشورہ طلب کیے بغیر از خود مشورہ دینا بہتر نہیں ہے، طرفہ کہتا ہے: نا اہل کے لیے اپنی ہمدردی خرچ مت کر جو شخص تیری رائے سے استغناء کرے تو اس سے بے پرواہ ہو جا! (اسلام میں مشورہ کی اہمیت صفحہ ۱۰۷)؛ البتہ اگر مشیر یہ سمجھے کہ کوئی شخص غلط راہ پر چلنے سے ہلاکت میں پڑ سکتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ اگر میں نے سکوت اختیار کیا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا تو اس وقت از خود بڑھ کر اظہار رائے کرنا اور صحیح راستہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے، جیسے ولایت و حکومت کی خواہش ممنوع ہے؛ مگر سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کی حکومت طلب کی تھی؛ اس لیے کہ وہاں اصلاح اسی طریق سے ممکن تھی۔

اللہ پر توکل

اللہ تعالیٰ نے مشورہ کا حکم دیا، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا کہ مشورہ کے بعد جس پہلو کو بھی اختیار کیا جائے، اس کے بارے میں اللہ پر توکل اور اعتماد رکھنا چاہیے؛ کیوں کہ مشورہ کا تعلق تدبیر سے ہے اور تدبیر پر تقدیر ہمیشہ غالب آتی ہے، اصحاب عقل اور ارباب نظر و ماہرین فن کی رائے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ درست اور مشروئہ منج بھی ہو، سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں؛ اس لیے ایک مسلمان کا کام ہے کہ مشورہ لینے کے بعد اس پر عمل کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین اور اعتماد رکھے۔

ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کا شرعی حکم

جس میں عام حالتوں میں ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے، بالخصوص نماز کی حالت میں کپڑا لٹکانے اور نماز سے قبل پائینچے موڑنے پر مدلل و مفصل بحث کی گئی ہے

از: مولانا امداد الحق بختیار قاسمی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

اسلام ایک ایسا جامع دستورِ حیات ہے، جس میں حیاتِ انسانی کی مکمل رہبری و رہنمائی موجود ہے، خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، انسان کی انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، اسلام نے جس طرح رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اصول بتائے ہیں، اسی طرح کپڑے پہننے کے سلسلے میں بھی مکمل رہنمائی فرمائی ہے، آپ ﷺ نے جس طرح غیر اسلامی اور غیر قوموں کے مشابہ لباس سے منع فرمایا ہے، اسی طرح ایسا لباس، جس میں تکبر کا شائبہ ہو، اس سے بھی آپ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے، اسلامی لباس کا ایک محکم ضابطہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ مردوں کا لباس ٹخنوں سے نیچے نہیں ہونا چاہیے، ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے پر آپ ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی ہے، ذیل میں اس سلسلہ کی احادیث ذکر کی جاتی ہیں:

متکبرانہ لباس کی ممانعت اور سخت وعید

عہدِ نبویؐ میں عرب متکبرین کا یہ فیشن تھا کہ کپڑوں کے استعمال میں بہت اسراف سے کام لیتے تھے اور اس کو بڑائی کی نشانی سمجھتے تھے، ”ازار“ یعنی تہبند اس طرح باندھتے تھے کہ چلنے میں نیچے کا کنارہ زمین پر گھسٹتا تھا، اسی طرح قمیص اور عمامہ اور دوسرے کپڑوں میں بھی اسی قسم کے اسراف کے ذریعہ اپنی بڑائی اور چودھراہٹ کی نمائش کرتے، گویا اپنے دل کے استکبار اور احساسِ بالا تری کے اظہار اور تفاخر کا یہ ایک ذریعہ تھا، اور اس وجہ سے متکبرین کا یہ خاص فیشن بن گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی اور نہایت سنگین وعیدیں اس کے بارے میں سنائیں:

عن ابن عمر، أن النبي ﷺ قال: مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خِيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنا کپڑا اکبر وغرور اور فخر کے طور پر (زمین پر) گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر کرم نہ فرمائے گا۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب قول النبی ﷺ: لو كنت متخذاً... حدیث نمبر: ۳۶۶۵)

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِزَارَةُ الْمُؤْمِنِ إِلَى أَنْصَافِ سَاقَيْهِ، لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْكُعْبَيْنِ، وَمَا أَسْفَلَ مِنْ ذَلِكَ فَفِي النَّارِ، قَالَ ذَلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَلَا يَنْظُرُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَرًا (ابوداؤد، الملباس، باب في قدر الموضع من الإزار، حدیث نمبر: ۴۰۹۵)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، فرماتے تھے کہ مومن بندے کے لیے ازار یعنی تہبند باندھنے کا طریقہ (یعنی بہتر اور اولیٰ صورت) یہ ہے کہ پنڈلی کے درمیانی حصہ تک ہو اور نصف ساق اور ٹخنوں کے درمیان تک ہو تو یہ بھی گناہ نہیں ہے، (یعنی جائز ہے) اور جو اس سے نیچے ہو تو وہ جہنم میں ہے (یعنی اس کا نتیجہ جہنم ہے) (راوی کہتے ہیں) کہ یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی (اس کے بعد فرمایا) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس آدمی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، جواز راہ فخر و تکبر اپنی ازار گھسیٹ کے چلے گا۔

تشریح: ان حدیثوں میں فخر اور غرور والی لباس استعمال کرنے والوں کو یہ سخت وعید سنائی گئی ہے کہ وہ قیامت کے دن اس دن میں جب کہ ہر بندہ اپنے رب کریم کی نگاہ رحم و کرم کا سخت محتاج ہوگا، وہ اس کی نگاہ رحمت سے محروم رہیں گے، اللہ تعالیٰ اس دن ان کو بالکل ہی نظر انداز کر دے گا، ان کی طرف نظر کرم بھی نہ فرمائے گا، ہائے ایسے لوگوں کی محرومی و بدبختی! اللہم احفظنا!

حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کے لیے اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ تہبند اور اسی طرح پاجامہ نصف پنڈلی تک ہو اور ٹخنوں کے اوپر تک ہو، تو یہ بھی جائز ہے؛ لیکن اس سے نیچے جائز نہیں؛ بلکہ سخت گناہ ہے اور اس پر جہنم کی وعید ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی حدیث اور اس کی صحیح تشریح

عَنْ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خِيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللَّهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِذَا رِي يَسْتَرْخِي إِلَّا أَنْ أَتَعَاهَدَهُ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِنَّكَ لَسْتَ مِنْ يَفْعَلُهُ خِيَلَاءَ. (بخاری، کتاب اللباس، باب من جازا من غير خيلاء، حدیث نمبر: ۵۷۸۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی فخر و تکبر کے طور پر اپنا کپڑا زیادہ نیچا کرے گا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر بھی نہیں کرے گا، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا تہبند اگر میں اس کا خیال نہ رکھوں، تو نیچے لٹک جاتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو فخر و غرور کے جذبہ سے ایسا کرتے ہیں۔

(معارف الحدیث، کتاب المعاشرة والمعاملات ج ۶، ص ۳۸ تا ۳۹۲)

تشریح: حضرت ابوبکر صدیقؓ دبلے پتلے جسم والے تھے، جس کی وجہ سے کبھی کبھار چلتے ہوئے آپ کا تہبند بے دھیانی میں ٹخنوں سے نیچے سرک جاتا تھا، اور یاد آنے پر پھر فوراً آپ تہبند درست فرماتے، جس کی حدیث میں صراحت مذکور ہے، اور واضح طور پر یہ حضور ﷺ کی وعید کا مصداق نہیں ہے؛ لیکن صحابہ کرامؓ کا حال بالکل مختلف تھا، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی ادنیٰ سے ادنیٰ خلاف ورزی (چاہے ظاہری طور پر ہی کیوں نہ ہو یا غفلت و لاشعوری کے عالم میں ہی ہو) برداشت نہ کرتے تھے، اور اس کا حکم ضرور معلوم کرتے؛ تاکہ کوئی صورت معافی کی نکل آئے، اس کی مثال وہ واقعہ ہے کہ ایک صحابیؓ دوڑتے ہوئے حضور ﷺ کے پاس جا رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ ایسے دوڑتے ہوئے کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے چھوڑ دو میں منافق ہو گیا ہوں؛ کیوں کہ میری جو حالت حضور ﷺ کی مجلس میں رہتی ہے وہ بیوی بچوں کے درمیان نہیں رہتی، اور دو قسم کی حالت کارہنا ہی نفاق ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب التوبہ، باب فضل دوام الذکر والفکر...، حدیث نمبر: ۲۷۵۰)

اسی طرح کا معاملہ حضرت ابوبکرؓ کے ازار کا تھا، آپؓ نے کبھی بھی ارادے سے ٹخنوں سے نیچے تہبند نہیں باندھا، اور یہ حضرات صحابہ کرامؓ کی دینی فکر اور اطاعتِ حکمِ الہی اور حکمِ رسول کی اعلیٰ مثال ہے کہ وہ اپنے اُن اعمال کو جو صرف صورتِ مخالفت کی فہرست میں آتے ہیں، انھیں بھی صریح مخالفت تصور کرتے تھے، اور ان سے احتیاط برتتے تھے۔

نماز میں اسبابِ ازار سے متعلق احادیث

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَصْلِي مُسْبِلًا إِزَارَهُ، إِذْ قَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: إِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ ثُمَّ جَاءَ، ثُمَّ قَالَ: إِذْهَبْ فَتَوَضَّأْ، فَذَهَبَ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ! مَا لَكَ أَمَرْتَهُ أَنْ يَتَوَضَّأَ؟ قَالَ: إِنَّهُ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ مُسْبِلٌ إِزَارَهُ وَإِنَّ اللَّهَ جَلَّ ذِكْرُهُ لَا يَقْبَلُ صَلَاةَ رَجُلٍ مُسْبِلٍ إِزَارَهُ.

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنی ازار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہونے کی

حالت میں نماز پڑھ رہا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: جاؤ، دوبارہ وضو کر کے آؤ! تو وہ شخص وضو کر کے آیا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جاؤ، وضو کر کے آؤ! وہ شخص گیا اور وضو کر کے آیا، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: آپ ﷺ نے اسے وضو کرنے کا حکم کیوں فرمایا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ اپنی ازارٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہونے کی حالت میں نماز پڑھ رہا تھا اور اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتے، جو اپنی ازارٹخنوں کے نیچے لٹکائے ہوئے ہو۔ (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاسبال فی الصلاۃ، حدیث نمبر: ۶۳۸)

تشریح: اس حدیث کی علماء نے چند تاویلیں کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) دوبارہ وضو کرنے کا حکم نبی پاک ﷺ نے اس لیے عطا کیا؛ تاکہ وہ دوران وضو غور کر سکے اور اپنے عمل مکروہ پر متنبہ ہو کر، اس سے پرہیز کرے، نیز اکمل و افضل طریقے پر نماز ادا کرے۔
(۲) اسبال ازار کے عمل کی وجہ سے، اس سے جو گناہ سرزد ہوا ہے، وضو کے ذریعہ وہ گناہ ختم ہو جائے۔

(۳) آپ ﷺ نے دوبارہ وضو کرنے کا حکم زجراً و تنبیہاً فرمایا ہے۔

(۴) حدیث میں نماز کے قبول نہ ہونے سے مراد کامل قبولیت ہے، یعنی اسبال ازار کے ساتھ نماز پڑھنے والے کا فرض تو ادا ہو جائے گا؛ لیکن اسے اللہ تعالیٰ کی مکمل خوشنودی حاصل نہ ہوگی۔
لہذا اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسبال ازار سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ (مرقاۃ المفاتیح، باب الستر، الفصل الثانی ۲/۲۳۴، مکتبہ امدادیہ، ملتان، پاکستان)

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ أَسْبَلَ إِزَارَهُ فِي صَلَاتِهِ خِيَلًا فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ جَلَّ ذِكْرُهُ فِي حِلٍّ وَلَا حَرَامٍ. (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الاسبال فی الصلاۃ، حدیث نمبر: ۶۳۷)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص ازارہ تکبر نماز میں اپنی ازارٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہوئے ہو، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ اس کے لیے جنت حلال ہوگی، نہ جہنم حرام ہوگی۔

تشریح: اس حدیث میں اگرچہ علماء نے تاویل کی ہے؛ لیکن حدیث کے ظاہری الفاظ بہت سخت ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اسبال ازار کرنے والے کی نماز قبول نہیں فرماتے، لہذا ان مسلمانوں کے لیے اس حدیث میں لمحہ فکر یہ ہے، جو اسبال ازار کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، نیز دوسری

حدیث میں اسبال ازار کرنے والوں کو زبردست پھٹکار لگائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لیے نہ جنت حلال ہونے کا وعدہ ہے اور نہ جہنم حرام ہونے کی ضمانت، یعنی ایسا شخص جہنمی ہے، اس کا جنت میں داخلہ نہ ہوگا۔

کیا اگر تکبر نہ ہو تو ٹخنے سے نیچے کپڑے پہن سکتے ہیں؟

ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہننے کی وہاں اتنی عام ہو چکی ہے کہ عوام کا تو پوچھنا نہیں، بہت سے اہل علم بھی اس طرح کپڑے پہنتے ہیں اور جب ان کو ٹوکا جاتا ہے، تو وہ ان احادیث کا سہارا لیتے ہیں جن میں ”خیلاء“ یعنی تکبر کی قید مذکور ہے، نیز حضرت ابو بکرؓ کی حدیث سے بھی یہ حضرات استدلال کرتے ہیں، تقریباً یہی حال ان حضرات کا بھی ہے، جنہیں دین کی کچھ سوجھ بوجھ ہے اور وہ اپنی زندگی دین کے مطابق نہیں؛ بلکہ دین کو اپنی زندگی کے مطابق کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اللہ ان سب کو دین کا صحیح فہم عطا کرے اور ان کی زندگیوں کو نبی پاک ﷺ کی سنت کے مطابق کر دے۔ (آمین)

اسبال ازار کی احادیث میں ”خیلاء“ کی قید کی حقیقت

اسبال ازار کے سلسلے میں جتنی احادیث وارد ہوئی ہیں، انہیں دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) وہ احادیث جن میں ”خیلاء“ کی قید مذکور ہے، یعنی اگر کوئی تکبر کی بنا پر اسبال ازار کرتا ہے، اپنے آپ کو بہتر اور دوسرے کو گھٹیا سمجھتا ہے، تو ایسے شخص کے لیے وہ وعیدیں ہیں جو احادیث میں ذکر کی گئی ہیں۔

(۲) وہ احادیث جن میں ”خیلاء“ کی قید نہیں، یعنی آنحضرت ﷺ کی وعیدوں کا ہر وہ شخص مصداق ہے، جو اسبال ازار کرتا ہے، چاہے اس میں تکبر ہو، چاہے تکبر نہ ہو۔

اسبال ازار کب حرام ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ کیا پہلی قسم کی احادیث کے مطابق ”خیلاء“ یعنی تکبر کے ساتھ اسبال ازار ممنوع اور حرام ہے، اور اسی پر حضور ﷺ کی وعیدیں ہیں، یا دوسری قسم کی احادیث کے مطابق مطلقاً اسبال ازار حرام ہے، چاہے تکبر ہو یا نہ ہو؟

”خیلاء“ کی قید اتفاقی ہے

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کفار و مشرکین تفاخر و تکبر اور احساس برتری کے مظاہرے کے لیے اپنے کپڑوں میں حد سے زیادہ اسراف کرتے تھے، جب وہ چلتے تو ان کی چادریں اور لنگیاں زمین پر گھسٹتی تھیں، اور اسے وہ بڑائی کی علامت جانتے تھے، چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت

عثمان بن عفانؓ جب ایک سفیر کی حیثیت سے قریش کے پاس گئے، تو قریش نے حضرت عثمانؓ کی لنگی ٹخنوں سے اوپر دیکھ کر کہا: آپ اسے نیچی کر لیں؛ کیوں کہ رؤساء قریش اسے معیوب سمجھتے ہیں، تو آپؓ نے جواب دیا: ”لَا، هَكَذَا اِزْرَةُ صَاحِبِي ﷺ“ یعنی میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ میرے حبیب کی یہی سنت ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب المغازی، غزوة الحبشية، حدیث نمبر: ۳۶۸۵۲)

جن احادیث میں ”خیلا“ کی قید ہے، ان میں اس لفظ کے ذریعہ مشرکین کے اسی تکبر کی ترجمانی کی گئی ہے، اور ان کے متکبرانہ احوال کو اس لفظ ”خیلا“ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ ”خیلا“ کی قید مشرکین کی حالت اور واقعہ کو بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی یہ قید صرف واقعی ہے، احترازی نہیں ہے؛ لہذا اب تکبر ہو، یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہننا درست نہ ہوگا۔

کیا عرف و عادت کی وجہ سے اسبال ازار جائز ہے؟

نبی کریم ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ اور اتنی سخت وعیدوں کے بعد کسی ایمان کا دعویٰ کرنے والے کے لیے یہ گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ بلا کسی عذرِ شدید کے اسبال ازار کی جرأت کر سکے، اور ادنیٰ بھی دینی غیرت رکھنے والا کوئی مسلمان حضور ﷺ کے فرمانِ عالی کے مقابلہ میں عرف و عادت کو ترجیح نہیں دے سکتا اور اس کا بہانہ نہیں بنا سکتا، آنحضرت ﷺ نے خود اس عمل سے پوری زندگی اجتناب فرمایا اور اپنے صحابہؓ کو اس سے منع فرمایا؛ حالانکہ صحابہ کرامؓ امت کی سب سے بہترین جماعت ہیں، اگر تکبر نہ ہونے کا کسی کو دعویٰ ہو سکتا ہے، تو وہ اسی مقدس جماعت کو زیب دیتا ہے، لہذا اگر کبر نہ ہونے کی بنا پر اسبال ازار جائز ہوتا، تو حضور ﷺ اور تمام صحابہ کرامؓ کے لیے جائز ہونا چاہیے تھا۔

اسبال ازار ”کبر“ کی وجہ سے ہی ہوتا ہے

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ... وَإِيَّاكَ وَإِسْبَالَ الْأَزَارِ؛ فَإِنَّهُ مِنَ الْمَخِيَلَةِ وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيَلَةَ.

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسبال ازار سے بچو! کیوں کہ یہ تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں فرماتے۔ (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر: ۴۰۸۴)

تشریح: صحابہؓ کی طہارتِ باطنی کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا اسبال ازار سے ان کو منع فرمانا، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اسبال ازار کا یہ عمل ہی شریعت کے نزدیک فتنہ اور مکروہ ہے، چاہے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس کے اندر کبر نہیں ہے، بعض احادیث کے اندر ”خیلا“، یعنی کبر کی جو قید

آئی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو تکبراً ایسا کرے، اس کے لیے وعید ہے، اور جس میں تکبر نہیں ہے اس کے لیے اسبابِ ازار کی اجازت ہے؛ بلکہ اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اسبابِ ازار کا سبب ہی کبر ہے، یعنی جن کے اندر کبر ہوتا ہے وہی یہ حرکت کرتے ہیں، اسی حدیث کی وجہ سے صاحب فتح الباری علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

”وَحَاصِلُهُ أَنَّ الْإِسْبَالَ يَسْتَلْزِمُ جَرَ الثَّوْبِ، وَجَرُّ الثَّوْبِ يَسْتَلْزِمُ الْخِيَلَاءَ، وَلَوْ لَمْ يَقْصِدِ اللَّائِسُ الْخِيَلَاءَ“

یعنی اسبابِ ازار کپڑے گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور کپڑا گھسیٹنا تکبر کو مستلزم ہے، چاہے پہننے والا تکبر کا ارادہ نہ کرے۔ (فتح الباری ۳۲۵/۱۰، کتاب اللباس)

اسبابِ ازار مطلقاً حرام

علماء کی ایک بڑی جماعت نے تکبر اور عدم تکبر کے درمیان فرق کیے بغیر اسبابِ ازار کو حرام قرار دیا ہے، اور عدم تکبر کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا ہے؛ بلکہ حضور ﷺ کے ارشادات کے بعد اسبابِ ازار کرنے کو تکبر کی دلیل قرار دیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے: فتح الباری ۳۲۵/۱۰، کتاب اللباس)

اسبابِ ازار کی حالت میں پڑھی گئی نماز کا شرعی حکم

بہت سے مسلمان جن تک اسبابِ ازار کے سلسلے میں حضور ﷺ کی وعیدیں نہیں پہنچی ہیں، وہ جس طرح نماز سے باہر اسبابِ ازار کرتے ہیں، اسی طرح نماز میں بھی یہ عمل کرتے ہیں؛ جب کہ اسبابِ ازار کے سلسلے میں رسول پاک ﷺ کی وعیدیں بہت ہی سخت ہیں، نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”لَا يَقْبَلُ صَلَاةَ مُسْبِلٍ“، یعنی اللہ تعالیٰ اسبابِ ازار کرنے والے کی نماز قبول نہیں فرماتے، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اسبابِ ازار کی حالت میں جو نماز ادا کی گئی ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ وہ نماز دوبارہ پڑھی جائے گی، یا مکروہ تحریمی ہوگی یا مکروہ تنزیہی؟

اسبابِ ازار کی حالت میں نماز مکروہ

جس اسبابِ ازار کی حرکت سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اتنی سختی سے منع فرمایا ہے، اور جس پر اتنی شدید وعیدیں سنائی ہیں، اسی حرکت کو نماز میں کرنا، اللہ تعالیٰ کے سامنے اور اس کے دربار میں کرنا، کس درجہ قبیح، مذموم اور کتنا گھناؤنا اور برا عمل ہوگا، اس کا فیصلہ ہر ایمان رکھنے والا دل کر سکتا ہے؛ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ اسبابِ ازار کے ساتھ جو نماز ادا کی جائے، وہ مکروہ ہوتی ہے۔

ہاں اگر کوئی شرعی معذور ہے، تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر کسی کے بارے میں

غالب گمان ہو کہ اس میں تکبر نہ ہوگا (اور اس کا دعویٰ اس زمانے میں کون کر سکتا ہے اور اگر کوئی کرتا بھی ہے، تو یہ شیطانی دھوکہ ہے، الاما شاء اللہ) تو اس کی نماز اگرچہ اس درجہ مکروہ نہیں؛ لیکن فی الجملہ کراہت سے وہ بھی خالی نہیں۔

وَإِطَالَةُ الدَّلِيلِ مَكْرُوهَةٌ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيِّ فِي الصَّلَاةِ وَغَيْرِهَا. (مرقاۃ المفاتیح، باب الستر، الفصل الثانی ۶۳۴/۲، حدیث: ۷۶۱)

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک دامن (کپڑے) کوٹخنوں سے زیادہ لمبا کرنا نماز اور خارج نماز دونوں میں مکروہ ہے۔

صادق و مصدوق نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ اس مسئلہ میں بالکل صریح اور واضح ہیں کہ اسبابِ ازار علامتِ تکبر ہے، لہذا اس کے بعد تکبر نہ ہونے کا دعویٰ کرنا نفسانی اور شیطانی دھوکہ ہے، جو انسان کا کھلا دشمن ہے، جب صحابہؓ جیسی برگزیدہ اور مقدس جماعت کو اس سے گریز کرنے کا حکم دیا گیا، تو ہم اور آپ کس شمار میں آتے ہیں، لہذا ہر مسلمان کو نماز کے اندر بھی اور نماز کے باہر بھی اسبابِ ازار سے پورے طور پر اجتناب کرنا چاہیے!

نماز سے پہلے پینٹ وغیرہ کے پائینچے موڑنے کا حکم؟

اسبابِ ازار کے سلسلے میں جو احادیث اوپر آپ کے سامنے آئی ہیں، اسی طرح اسبابِ ازار کی حالت میں نماز کا جو حکم بیان کیا گیا ہے، اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ پیارے نبی ﷺ کی حدیث سے محبت رکھنے والا ہر مومن اپنی پوری زندگی میں اس عمل سے بالکل گریز کرے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی انھیں احادیث کے احترام میں ہمارے اکثر مسلمان بھائی نماز سے قبل پینٹ وغیرہ کے پائینچے موڑ لیتے ہیں؛ تا کہ ٹخنے کھل جائیں اور کم از کم نماز میں اس گناہ سے بچ سکیں اور ان کی نماز سنت کے مطابق ادا ہو جائے۔

کیا نماز سے قبل پائینچے موڑنا مکروہ ہے؟

تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا نماز سے پہلے پائینچے موڑنے کا یہ عمل درست ہے، اس طرح کرنے سے نماز میں کوئی کراہت تو نہیں آئے گی؛ کیوں کہ بعض حضرات پائینچے موڑنے کے عمل کو درست قرار نہیں دیتے، اور وہ کہتے ہیں کہ اسبابِ ازار کی حالت میں ہی نماز ادا کی جائے؟

نماز سے قبل پائینچے موڑنا درست ہے

احادیثِ مبارکہ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم کپڑے ایسے ہی بنوائیں جن میں خود بخود ٹخنے کھلے

رہیں، پانچے موڑنے کی ضرورت پیش نہ آئے؛ لیکن ہمارے اکثر نوجوان جو چست جینز یا دیگر پیئٹ پہنتے ہیں، جن میں پانچے موڑے بغیر ٹخنے کھولنے کی کوئی دوسری شکل نہیں ہوتی، تو اب ان کے سامنے دو ہی صورت رہ جاتی ہے، (۱) اسی حالت میں (یعنی ٹخنے ڈھکے ڈھکے) نماز پڑھنا، (۲) پانچے موڑ کر نماز پڑھنا۔

پہلی صورت میں وہ مندرجہ بالا ان تمام احادیث کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں گے، جن میں اس عمل کی قباحت بیان کی گئی ہے، لہذا ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ نماز سے قبل پانچے موڑ لیں؛ تاکہ کم از کم نماز کی حالت میں اس گناہ سے بچ سکیں، خلاصہ یہ ہے کہ ٹخنوں سے نیچے کپڑا رکھنا حدیث کی خلاف ورزی ہے اور کم از کم نماز میں پانچے موڑ کر ٹخنوں کو کھلا رکھنا ضروری ہے۔ نماز سے قبل پانچے موڑنے کی مخالفت کرنے والے

بعض مکاتب فکر کے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کسی کا کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہے، تو وہ نماز سے قبل اپنے پانچے نہ موڑے؛ کیوں کہ یہ عمل مکروہ ہے، جس سے نماز میں کراہت آتی ہے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے اس عمل کو مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، اور بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ نماز واجب الاعداد ہوگی۔

مخالفین کے دلائل

یہ حضرات اپنے اس موقف اور مسلک کی تائید میں کئی دلائل پیش کرتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلی دلیل: آنحضرت ﷺ کی وہ حدیث مبارک جس میں کپڑے اور بالوں کو سمیٹنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنهما، عن النبي ﷺ قال: أُمِرْتُ أَنْ أُسْجِدَ عَلَى سَبْعَةٍ، لَا أَكْفُ شَعْرًا وَلَا ثَوْبًا.

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں، اور نہ بالوں کو سمیٹوں اور نہ کپڑوں کو۔ (بخاری، کتاب الصلاة، باب لا یکف ثوب فی الصلاة، حدیث نمبر: ۸۱۶)

تشریح: اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ کپڑوں کا سمیٹنا ممنوع ہے، اور پانچے موڑنا بھی کپڑے کا سمیٹنا ہے، لہذا وہ بھی ممنوع ہوگا۔

دوسری دلیل: فقہاء کی وہ عبارتیں ہیں جن میں ”کَفَّ ثَوْب“ کی کراہت کا حکم بیان کیا

گیا، جیسے ”در مختار“ میں ہے:

وَكُرْهَ كُفَّهٖ: أَي رَفَعَهُ، وَلَوْ لُتْرَابٍ، كَمْشِمٍ كُمٍّ أَوْ ذَيْلٍ. (در مختار علی رد المحتار ۲/۴۰۶)
مکروہ ہے کپڑے کو سمیٹنا، چاہے مٹی سے بچنے کے لیے ہو، جیسے آستین چڑھانا اور دامن سمیٹنا۔
اور شامی میں اس کے تحت لکھا ہے:

”وَأَشَارَ بِذَلِكَ إِلَى أَنَّ الْكَرَاهَةَ لَا تَخْتَصُّ بِالْكَفِّ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ“

اس کے ذریعہ مصنف نے اشارہ کیا ہے کہ کپڑا سمیٹنے کی کراہت نماز کی حالت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ (رد المحتار ۲/۴۰۶)

پہلی عبارت میں مطلقاً کپڑا سمیٹنے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، اور شامی میں یہ صراحت کی گئی کہ کپڑا سمیٹنا، چاہے نماز کے اندر ہو، یا اس سے پہلے، دونوں حالتوں میں مکروہ ہے، لہذا دونوں عبارتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان جو کپڑا پہنے ہوئے ہے، اگر اسے کہیں سے بھی موڑے، تو یہ عمل مکروہ ہوگا، اور پائینچے موڑنا بھی اسی قبیل سے ہے، لہذا یہ بھی مکروہ ہوگا۔

تیسری دلیل: پائینچے موڑنے سے بذیقت پیدا ہوتی ہے، اور بری ہیئت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے، لہذا پائینچے موڑنے کا عمل بھی مکروہ ہوگا۔

مخالفین کے دلائل کا حقیقت پسندانہ جائزہ

پہلی دلیل کا جائزہ: پہلی دلیل میں نبی پاک ﷺ کی جس حدیث سے پائینچے نہ موڑنے پر استدلال کیا گیا ہے، یہ استدلال درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اس حدیث میں ”کف ثوب“ (یعنی کپڑے سمیٹنے) سے مراد ”ازار“ کے علاوہ قمیص اور چادر وغیرہ ہیں، اور اس کی حکمت صاحب فتح الباری شرح صحیح البخاری علامہ ابن حجرؒ نے یہ لکھی ہے:

”وَالْحِكْمَةُ فِي ذَلِكَ أَنَّهُ إِذَا رَفَعَ ثَوْبَهُ وَشَعْرَهُ عَنْ مُبَاشَرَةِ الْأَرْضِ أَشْبَهَ الْمُتَكَبِّرَ“

(فتح الباری ۲/۳۷۷، کتاب الصلوٰۃ، باب السجود علی سبعۃ اعظم)

اور حکمت اس میں یہ ہے کہ جب وہ اپنے کپڑے اور بالوں کو مٹی لگنے کے ڈر سے اٹھائے گا، تو اس میں متکبرین کے ساتھ مشابہت پیدا ہوگی۔

اور پائینچے موڑنا سنت پر عمل کرنے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ تکبر کی وجہ سے؛ لہذا یہ اس حدیث کے تحت داخل نہیں، نیز ایک دوسری حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جو نیچے پیش کی جاتی ہے۔

حدیث سے پائینچے موڑنے کی تائید

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایک مرتبہ اس طرح نماز پڑھائی کہ آپ ﷺ ازار کو نیچے سے اٹھائے ہوئے تھے:

عن أبي جحيفة قال: فرأيت رسول الله ﷺ خَرَجَ فِي حُلَّةٍ مُشَمِّرًا، فَصَلَّى رَكَعَتَيْنِ إِلَى الْعُنْزَةِ..

حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ ایک ایسے لباس میں تشریف لائے، جس میں ازار کو نیچے سے اٹھائے ہوئے تھے، اور آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھائی۔

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب التشریف الثياب، حدیث نمبر: ۵۷۸۶)

ایک دوسری سند میں یہ الفاظ بھی ہیں: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى بَرِيقِ سَاقِيهِ... یعنی صحابیؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی ازار نیچے سے اتنی اٹھا رکھی تھی، گویا کہ میں آپ کی پنڈلیوں کی چمک ابھی تک دیکھ رہا ہوں۔

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے ”مُشَمِّرًا“ جو ”تشمیر“ سے بنا ہے، اور تشمیر الثوب کے معنی لغت میں ہیں: آستین چڑھانا، پائینچے موڑنا، پاجامہ ٹخنوں سے اوپر کرنا۔ (القاموس الوجید ۸۸۶/۱، مادہ: ش م ر) نیز علامہ ابن حجرؒ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں: ”رَفَعَ أَسْفَلَ الثَّوْبِ“ یعنی کپڑے کے سب سے نچلے حصے کو اٹھانا۔ (فتح الباری ۳۱۵/۲) جس کی ایک شکل پینٹ یا پانچامے کے پائینچے موڑنا بھی ہے۔

پائینچے موڑنا ”کفِ ثوب“ کی حدیث کے تحت داخل نہیں

اسی لیے علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ احادیث میں ”کفِ ثوب“ کی جو مانعت آئی ہے، وہ ”ازار“ وغیرہ کے علاوہ میں ہے:

وَيُؤْخَذُ مِنْهُ أَنَّ النَّهْيَ عَنْ كَفِّ الثِّيَابِ فِي الصَّلَاةِ مَحْلُهُ فِي غَيْرِ ذَلِيلِ الْإِزَارِ... (فتح الباری ۳۱۶/۲)

اس حدیث سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ نماز میں ”کفِ ثوب“ کی ممانعت ”ازار“ کے نچلے حصے کے علاوہ میں ہے۔

دونوں حدیثوں کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ پہلی حدیث میں ”کفِ ثوب“ سے مراد ”ازار“ کے علاوہ دیگر کپڑے ہیں، اور ان کپڑوں میں ”کفِ ثوب“ کی علت متکبرین کے

ساتھ مشابہت ہے، اور دوسری حدیث نیز علامہ ابن حجر کی شرح سے یہ واضح ہو گیا کہ ”ازار“ کے نچلے حصے کو اٹھانا، یا موڑنا ”کف ثوب“ کی ممانعت میں داخل نہیں، لہذا پانچ موڑنے کی مخالفت کرنے والے ہمارے بھائیوں کو دونوں حدیثوں کو سامنے رکھ کر اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے!

دوسری دلیل کا جائزہ: حدیث کی اس بھرپور توضیح و تشریح سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہو گیا کہ فقہ کی کتابوں میں جس ”کف ثوب“ کو مکروہاتِ صلوٰۃ میں شمار کیا گیا ہے، وہاں بھی ”کف ثوب“ یعنی کپڑے سمیٹنے سے مراد ”ازار“ کے علاوہ دیگر کپڑے ہیں، اور پینٹ یا پاجامہ وغیرہ کا موڑنا اس میں داخل نہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ فقہ کی عام کتابوں میں ”کف ثوب“ کی مثال میں آستین اور قمیص کے دامن کا تذکرہ ملتا ہے، کہیں ازار یا پاجامے کا ذکر نہیں ملتا۔

نیز فقہ کی کتابوں میں بھی ”کف ثوب“ کی وہی علت بیان کی گئی، جو مذکورہ بالا حدیث کی تشریح میں علت میں گزری ہے، یعنی متکبرین کے ساتھ مشابہت؛ چنانچہ کنز الدقائق کی شرح تبیین الحقائق میں لکھا ہے: ”(وَكَفَّ ثَوْبَهُ) لِأَنَّهُ نَوُّعُ تَجَبُّرٍ“

اور نماز کے مکروہات میں کپڑے کا سمیٹنا ہے؛ کیوں کہ یہ تکبر کی ایک قسم ہے۔ (تبیین الحقائق

۱/۶۲، باب ملغسہ الصلوٰۃ وما یکرہ فیہا)

تیسری دلیل کا جائزہ: ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ پانچ موڑنے سے بدہیئت پیدا ہوتی

ہے اور بری ہیئت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس دلیل کے دو جواب ہیں:

(۱) ٹخنے سے اوپر کپڑا کرنے کو بدہیئت قرار دینا، بعینہ جدید دور کے افراد کے ذہنوں کی ترجمانی ہے؛ کیوں کہ سوائے چند حضرات کے ماڈرن دور کا کوئی بھی فرد ٹخنے سے اوپر کپڑا پہننے کو، چاہے جس طرح بھی ہو، اچھی ہیئت قرار نہیں دیتا؛ بلکہ اس میں عار محسوس کرتا ہے، اور اسے معیوب سمجھتا ہے، تو کیا ہم ان کے معیوب سمجھنے کی وجہ سے اپنے پیارے آقا ﷺ کی سنت کو چھوڑ دیں گے!

(۲) ٹخنوں سے اوپر پانچ رکھنے کو بدہیئت قرار دینا غلط اور بلا دلیل ہے؛ کیوں کہ قاعدہ ہے کہ

جو ہیئت حضور پاک ﷺ سے ثابت ہو، وہ بری ہیئت نہیں ہو سکتی، اور اس ہیئت کے ساتھ نماز مکروہ نہیں ہوگی، اور ٹخنے کھلے رکھنے، نیز ”ازار“ اوپر اٹھانے کا عمل آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، جیسا کہ ابھی احادیث میں گزرا، لہذا اسے بدہیئت قرار دینا، رسول اللہ ﷺ کے عمل اور آپ کی سنت کے خلاف ہوگا، جیسا کہ گرتے کے بٹن کھلے رہنا بھی بظاہر بدہیئت ہے؛ لیکن حضور ﷺ سے ثابت ہے، اس لیے مکروہ نہیں، اور اس سے نماز میں کراہیت نہیں آتی۔ (ابوداؤد، کتاب الملباس، باب فی حل الازرار، حدیث نمبر: ۴۰۸۲)

نماز سے پہلے پائینچے موڑنے کے سلسلے میں علماء حق کے فتاویٰ

نماز سے قبل پائینچے موڑنے کے جواز کے فتاویٰ، کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں؛ لیکن اختصار کے پیش نظر ہم صرف دو فتوؤں پر اکتفا کرتے ہیں، ایک دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ، دوسرا علماء عرب کا فتویٰ۔

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ

دارالعلوم دیوبند کے فتوے میں سائل نے نماز سے قبل پائینچے موڑ کر ٹخنے کھولنے سے متعلق مسئلہ دریافت کیا ہے، بعض مخالفین نے جو اسے شبہے میں ڈالا تھا، ان کے دلائل کا مدلل جواب بھی طلب کیا ہے، فتوے میں ان تمام دلائل کے تسلی بخش جوابات دیے گئے ہیں، اور نماز سے قبل پائینچے موڑنے کے عمل کو درست قرار دیا گیا ہے، فتویٰ بعینہ آپ کی خدمت میں پیش ہے:

سوال: کیا پائینچے ٹخنوں سے نیچے اگر ہو رہے ہوں تو انھیں اگر موڑ کر نماز پڑھ لی جائے تو پائینچے موڑنے کا عمل مکروہ تحریمی کہلائے گا اور نماز واجب الاعداء ہوگی، نیز اگر کپڑے یا ٹوپی کا کوئی حصہ مڑ جائے تو تب بھی یہی حکم ہے؟ اس کے حوالے میں بریلوی حضرات مختلف فقہاء کے اقوال نقل کرتے ہیں:

- (۱) علامہ ابن العابدین الشامی فرماتے ہیں: أَيُّ كَمَا لَوْ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ مُشَمِّرٌ كُمَةً أَوْ ذَيْلَهُ وَأَشَارَ بِذَلِكَ إِلَى أَنَّ الْكَرَاهَةَ لَا تَخْتَصُّ بِالْكَفِّ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ. (رد المحتار)
- (۲) وَكَرِهَ كُفَّهُ أَيْ رَفَعَهُ وَلَوْ لَتَرَابٍ كُمَشَمِّرٍ كُمٍ أَوْ ذَيْلٍ. (رد مختار)
- (۳) جوہرہ نیرہ میں ہے: وَلَا يَكُفُّ ثَوْبَهُ وَهُوَ أَنْ يَرْفَعَهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ أَوْ مِنْ خَلْفِهِ إِذَا أَرَادَ السُّجُودَ. (الجوہرۃ النیرۃ ۶۳/۱)

(۴) قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَمَرْتُ أَنْ أُسْجِدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظَمٍ لَا أَكُفُّ ثَوْبًا وَلَا أَغْقُصُ شَعْرًا.

(۵) حضرت امام بصریؒ سے روایت ہے: كف ثوب کرنے والے کی نماز مکروہ تحریمی ہے۔ (۹۱/۲)

آپ سے درخواست یہ ہے کہ ان حوالوں کا مدلل جواب دیں۔

جواب: ٹخنوں سے نیچے پانچامہ یا لنگی لٹکانا سخت گناہوں میں سے ایک ہے، جن پر جہنم کی وعید آئی ہے؛ اس لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس حکم کی خلاف ورزی کر کے ٹخنے سے نیچے پانچامہ

اور پینٹ وغیرہ لٹکائے، عام حالات میں بھی یہ جائز نہیں ہے، اور نماز میں تو اور زیادہ قبیح ہے، ”اسبال“ (ٹخنے سے نیچے پاؤں یا پینٹ وغیرہ لٹکانا) مطلقاً ناجائز ہے، اگرچہ ”مسبل“ (لٹکانے والا) یہ ظاہر کرے کہ میں تکبر کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں؛ ہاں! اگر غیر اختیاری طور پر ایسا ہو جائے، یا کسی یقینی قرینے سے معلوم ہو کہ اس میں کبر نہیں تو یہ حکم نہیں لگے گا، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے واقعہ میں ہے۔

لہذا تکبر اور غیر تکبر کے درمیان فرق کرنا، ایک کو ناجائز اور دوسرے کو جائز کہنا، یا ایک کو مکروہ تحریمی اور دوسرے کو تنزیہی شمار کرنا شرع حدیث کی تشریح کے مطابق صحیح نہیں؛ اس لیے کہ حدیث کے اندر ٹخنے سے نیچے پاؤں وغیرہ لٹکانے اور اس کے کھینچنے کو تکبر کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور جن احادیث کے اندر ”خیلا“ کی قید مذکور ہے، یہ قید احترازی نہیں ہے؛ بلکہ قید اتفاقی یا واقعی ہے کہ ازار لٹکانے والا متکبر ہی ہوتا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ ٹخنوں سے اونچا پاؤں یا پینٹ پہننے میں عار آتی ہے، یا ایسے پہننے والوں کو نظرِ حقارت سے کیوں دیکھتے ہیں؟ اس بابت ان سے مضحکہ بھی کرتے ہیں،...

یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسبال مطلقاً ”جرتوب“، یعنی کپڑا اٹھینے کو مستلزم ہے، اور جرتوب تکبر کو مستلزم ہے، اگرچہ پہننے والا تکبر کا ارادہ نہ کرے۔ (فتح الباری ۱۰/۲۵۴)۔ لہذا اگر کوئی آدمی اس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے یعنی لنگی پینٹ وغیرہ ٹخنے سے نیچے لٹکا کر پہنتا ہے؛ لیکن یہ نماز کے وقت پائینچے کو اوپر چڑھا لیتا ہے؛ تاکہ نماز کے وقت کم از کم گناہ سے بچے، اور اس حدیث کا مصداق نہ بنے اور اس کی نماز اللہ کے یہاں مقبول ہو جائے تو یہ عمل مستحسن ہوگا نہ مکروہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بوقت نماز پائینچے کو اوپر چڑھا کر نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی کہنا نہ تو شرعاً صحیح ہے اور نہ عقلاً، سوال میں فقہاء کی جن عبارتوں اور ترمذی کی جس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے ان سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتا، ذیل میں یہ عبارت ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) كَمْشِمِرٌ كُمْ أَوْ ذَيْلٌ أَيْ كَمَا لَوْ دَخَلَ فِي الصَّلَاةِ وَهُوَ مُشِمِرٌ كُمَهُ أَوْ ذَيْلَهُ وَأَشَارَ بِذَلِكَ إِلَى أَنَّ الْكَرَاهَةَ لَا تَخْتَصُّ بِالْكَفِّ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ. (ردالمحتار)

(۲) وَلَا يَكْفُ ثَوْبُهُ وَهُوَ أَنْ يَرْفَعَهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ أَوْ مِنْ خَلْفِهِ إِذَا أَرَادَ السُّجُودَ.

(۳) قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ لَا أَكْفُ ثَوْبًا وَلَا

أَعْقُصُ شَعْرًا.

حدیث شریف اور فقہی عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کے لیے مکروہ ہے کہ وہ آستین چڑھا کر نماز میں داخل ہو، یا دوران نماز اپنے کپڑے کو آگے پیچھے سے سمیٹے؛ تاکہ مٹی وغیرہ نہ لگے، یا پہلے سے کپڑے کو اٹھائے رکھے، مٹی سے بچانے یا اظہار تکبر کے مقصد سے؛ چنانچہ کنز کی مشہور شرح نمینین الحقائق میں مکروہ ہونے کی علت لکھی ہے ”وَلَاِنَّهُ نَوْْعُ تَجَبُّرٍ“ یعنی کراہت اظہار تکبر کی وجہ سے ہے اور اس کے حاشیہ میں ”كف الثوب“ کے تحت لکھا ہے ”وہو اَنْ يَضُمَّ اَطْرَافَهُ اِتِّقَاءَ التُّرَابِ“ اسی طرح ہدایہ میں بھی اس کی علت ”لَاِنَّهُ نَوْْعُ تَجَبُّرٍ“ لکھی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ”كف ثوب“ کا یا تو یہ مطلب ہے کہ دوران نماز کپڑا سمیٹے، صاحب غنیۃ المستملی نے یہی تفسیر کی ہے، اس صورت میں کراہت کی وجہ نماز میں دوسرے کام میں مشغول ہونا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ مطلقاً ”كف ثوب“ مکروہ ہے، خواہ دوران نماز ہو یا کپڑا سمیٹ کر نماز میں کھڑا ہو، تو اس کی وجہ اظہار بڑکین (تکبر) ہے کہ نماز میں عبث کے اندر مشغول ہونا ہے، نیز شامی کی عبارت ”كمشمر کم...“ (یعنی آستین چڑھا کر نماز پڑھنا) سے پائینچے وغیرہ کو چڑھا کر نماز پڑھنے کی کراہت پر استدلال صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنے کا کوئی شرعی مقصد نہیں ہے؛ کیوں کہ اس سے بے ادبی اور تکبر ظاہر ہوتا ہے، برخلاف نماز کے لیے پائینچے چڑھانا، یہ ایک نیک مقصد یعنی کم از کم دوران نماز گناہ سے بچنے کے لیے ہے اور اس میں نہ تو تکبر ہے اور نہ ہی بے ادبی۔

الغرض! ان عبارات سے اس پر استدلال کرنا کہ نماز پڑھنے کے وقت پائینچے کو اوپر چڑھا نا مکروہ تحریمی ہے، صحیح نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند فتویٰ (د) ۹۳: ۲۱-۲۱۳۳۲

علماء عرب کا فتویٰ

عرب کا ایک باشندہ جو نماز سے قبل پینٹ کے پائینچے موڑتا تھا، جب اس کے سامنے وہ حدیث آئی، جس میں حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ”میں نہ کپڑے سمیٹتا ہوں اور نہ بالوں کو اٹھاتا ہوں“ تو اس نے اپنے اس عمل کا حکم اور حدیث کا مطلب دارالافتاء سے معلوم کیا۔

فتوے میں یہ بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ نماز سے قبل پائینچے موڑنا ”كف ثوب“ کی ممانعت والی حدیث کے تحت داخل نہیں ہے، لہذا یہ عمل درست ہے، فتویٰ کا ترجمہ درج ذیل ہے:

سوال: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں اور نہ کپڑوں کو موڑوں اور نہ ہی بالوں کو سمیٹوں، اب سوال یہ ہے کہ ہم کام کے اوقات میں اپنے

پا عجامہ وغیرہ کو نیچے سے موڑتے ہیں؛ تاکہ نماز کے وقت (بھی) اسبال کے گناہ سے بچ سکیں تو کیا ہمارا یہ عمل درست ہے؟

جواب: الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی آلہ وصحبہ أما بعد! سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ حدیث ”ولا أكف ثوبا وشعراً“ نیز ”ولا أكف“ کے الفاظ کے ساتھ کتب حدیث میں مذکور ہے، لیکن ”وأن لا أطوي“ کا لفظ غیر معروف ہے۔

رہا مسئلہ کا حکم، تو اسبال ازار نماز اور خارج نماز دونوں میں ممنوع ہے، جیسا کہ بہت ساری احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لہذا اگر کوئی مصلی اپنا کپڑا نماز کی حالت میں اسبال کی حد سے اوپر اٹھاتا ہے تو وہ مذکورہ بالا حدیث کا مصداق نہیں ہوگا، جس میں کپڑا موڑنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؛ اس لیے کہ نماز اور خارج نماز میں کپڑے کا موڑنا ایک حکم شرعی ہے، اور کئی اہل علم نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ نماز میں کپڑا موڑنے میں کراہت اس وقت ہوتی ہے؛ جب کہ یہ عمل بلا ضرورت ہو، اگر ضرورت کی وجہ سے ہو تو اس میں کوئی کراہت نہیں ہے، روض الطالب کے شافعی مصنف لکھتے ہیں کہ نمازی کے لیے بلا ضرورت اپنے بالوں اور کپڑوں کا سمیٹنا مکروہ ہے، فقط واللہ اعلم۔

حرف آخر

اس پوری بحث اور حضور پاک ﷺ کی احادیث مبارکہ نیز محدثین کرام کی تشریحات اور فقہاء کی عبارتوں سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو گیا کہ اسبال ازار شریعت کی نگاہ میں ممنوع اور حرام ہے، چاہے اسبال ازار کرنے والا یہ دعویٰ کرے کہ اس میں تکبر نہیں ہے، نیز یہ مسئلہ بھی بالکل صاف ہو گیا کہ اگر کوئی مسلمان گناہ سے بچنے کے لیے نماز سے پہلے اپنی پیٹ و غیرہ کے پائینچے موڑتا ہے؛ تاکہ اس کی نماز سنت کے مطابق ہو اور وہ کم از کم نماز کی حالت میں اسبال ازار کے گناہ سے بچ سکے، تو اس کا یہ عمل بالکل درست ہے، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے، لہذا جو حضرات نماز سے قبل پائینچے موڑنے کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اپنے مسلک سے اوپر اٹھ کر ان احادیث اور محدثین کی ان تشریحات کو بغور پڑھنا چاہیے، جن میں اس عمل کی انتہائی مذمت اور قباحیت بیان کی گئی ہے، اور پائینچے موڑنے اور ٹخنے کھولنے کے عمل کو درست قرار دیا گیا ہے۔

قرآن فہمی اور ہمارے درمیان حائل پردے

از: حکیم سید مزمل حسین نقشبندی

مدیر اعلیٰ: ماہنامہ علوم ربانیہ، لاہور

روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کی ایک آیت سیکھتے، اس کو سمجھتے اس آیت میں بیان کردہ حکم کے مطابق اپنی زندگی ڈھال لیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید میں تدبر کیا، اس کے معانی و مقصود کو سمجھا، اس کے مطابق عملی زندگی اختیار کی تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قومیں جو باہمی انتشار و خلفشار کا شکار تھیں، جو چھوٹی چھوٹی اور رذیل باتوں کی بنیاد پر سالہا سال میدان جنگ میں برسرِ پیکار رہیں اور بعض دفعہ تو سبب جنگ بھی نہ ہوتا کہ محض انا پرستی کی خاطر گشتوں کے پُشتے لگا دیے جاتے، جو اتحاد و یگانگت جیسی دولتِ عظمیٰ سے محروم تھیں، جو دل ہلا دینے والی عادات و خرافات کا مظہر تھیں، انھیں قوموں نے جب قرآن کے بیان کردہ طرزِ زندگی کو اپنایا، کلامِ الہی کی معرفت اپنی زندگیوں کو قرآنی سانچے میں ڈھالا تو ان کا شمار دنیا کی بہترین قوموں میں ہونے لگا۔ وہ قومیں دنیا میں ایسی چھائیں کہ ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ باہمی انتشار و خلفشار کو پسِ پشت ڈال کر مواخات کی شکل میں اتحاد و یگانگت کی ایسی فضا قائم کی کہ قیامت تک آنے والی قومیں حیران ہیں کہ یہ کیسا درس اور کیسا سبق تھا کہ ایک انصار ایک مہاجر کو اپنی بیوی تک کو عقد میں دینے کے لیے تیار ہے۔ رذیل عادات و خرافات کو خیر باد کہہ کر معرفتِ الہی کی جستجو میں ایسے غرق ہوئے کہ فرشتے ان پر رشک کرتے اور خلقِ آدم پر اعتراض کی بناء پر نادم و شرمندہ ہو کر پانی پانی ہو جاتے تھے۔ وہ نیک سرشت لوگ جانتے تھے کہ یہ حکیمانہ کتاب، زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور زندگی کا کوئی پہلو اس سے مخفی نہیں۔ اسی نظریے پر چلتے ہوئے انھوں نے زندگی کے ہر مسئلے کا حل اس کتاب میں ڈھونڈا اور ترقی کے اوجِ ثریا تک پہنچ گئے۔

آج مسلم امہ کی صورتحال عیاں ہے۔ باہمی انتشار و خلفشار، مسلم ممالک کی بگڑتی ہوئی

سیاسی صورتحال، معاشی کیفیت، اپنوں کی غداری اور کفر کی یلغار، عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور دنیا کے کونے کونے سے اٹھنے والے اسلام مخالف طوفان اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کا پیش خیمہ ہیں۔ قرونِ اولیٰ کی طرح آج بھی قرآن سے وابستگی ضروری و لازم ہو چکی ہے۔ سچ جانو! ہم نے قرآن کو تدبر کی بجائے پس پشت ڈال دیا، فہم قرآن کی بجائے اپنے اور قرآن کے درمیان دبیز پردے حائل کر لیے جس کا خمیازہ بحیثیت مجموعی ہم بھگت رہے ہیں۔ قرآن کی آیات پر عمل کرنے کی بجائے اُسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ کفر کی کوششیں تو بجا، مسلمانوں کے ہی ایک مادیت پرست طبقے نے قرآن اور مسلم امہ کے درمیان دبیز پردوں کی ایک تہہ کھڑی کر دی ہے، نتیجتاً مسلم اُمہ حکمرانی کی بجائے خود محکوم بن کر رہ گئی ہے۔

ذیل میں ہم قرآن فہمی اور تدبر قرآن میں حائل پردوں کا ذکر کرتے ہیں:

- ۱- ہر اسلامی ملک میں اندرونی و بیرونی قوتوں نے مقدور بھر کوششیں کی ہیں کہ عملی زندگی کو قرآن کے بیان کردہ طرزِ زندگی کی بجائے مغربی سیکولرازم کے خطوط پر چلایا جائے نتیجتاً بعض جگہ ان کوششوں کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے، بعض جگہ جزوی کامیابی ملی جبکہ بعض جگہ کشمکش جاری ہے۔
- ۲- جن ممالک میں سیکولرازم کی تبلیغ میں خاطر خواہ نتائج کے حصول میں غیر معمولی رکاوٹیں ہیں، وہاں فکر و نظر کے دائرہ کار میں رہ کر یہ سعی کی جا رہی ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ہی سے ایسے افراد کو منتخب کیا جائے جو اسلام کے اساسی تصورات پر قدامت پرستی کا لیبل چسپاں کرتے ہیں جس میں ٹی وی پر نمودار ہونے والے ”مشہور اسکالر“ سر فہرست ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جو ”قدامت پسند“ اسلام کے مقابلے میں ”ماڈرن اسلام“، تشکیل دینے میں مصروف عمل ہیں۔

- ۳- مسلم ممالک کی سیاسی صورتحال یہ ہے کہ آزادی سے قبل غیر مسلم حکومتوں کے شکنجے میں تھے اور اب آمریتوں کے زیر تسلط آرہے ہیں، ہر ملک میں آئے دن سیاسی و عسکری انقلابات واقع ہو رہے ہیں، دنیا کو اتحاد و یگانگت اور شورایت کا درس دینے والی قوم اپنے پیش کردہ نظام کے نفاذ سے محروم ہے۔ آئے دن اپنے ہاتھوں اپنی ہی قوتوں کی بربادی، عارضی اقتدار کی بھوک، ایک مستقل عدم استحکام کا تصور، بے یقینی کی کیفیت کا تسلسل، کشتیِ جمہوریت کا نئے نئے طوفانوں سے ٹکراؤ اور پھر ان حالات میں مسلم ممالک کو توڑنے اور منقسم کر کے داخلی و خارجی سازشیں تدبیر قرآن اور فہم قرآن میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان سنگین حادثات کو

نظر انداز نہیں کر سکتے جو عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں اسلامی تحریکات کو چکنے اور ان تحریکات کو فعال اور متحرک بنانے والی شخصیات کو موت کے گھاٹ اتارنے کی شکل میں پیش آتے رہے ہیں۔ ان سنگین حادثات کی کڑیاں یا تو اسلام دشمن قوتوں سے ملتی ہیں یا ایسے نام نہاد اور مادیت پرست مسلم عناصر سے جو کفر کے ٹکڑوں پر پلے، پڑھے اور بڑھے ہیں۔ ایسے واقعات نے عام مسلمانوں کو قرآن جاننے، سمجھنے اور اس کے اجتماعی نظام کے علمبردار بن کر کام کرنے سے خوفزدہ کر دیا ہے۔ وہ قرآن کو پڑھنے، سمجھنے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کی دعوت دینے والوں کا انجام دیکھ کر غیر شعوری طور پر ڈر گئے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں کے نئے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے ہم ادب کے محاذ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمارا جدید ادب پوری دنیائے اسلام میں ایسے عناصر کے تصرف میں ہے جو اس میں ملحدانہ افکار کا زہر مسلسل بھرتے آرہے ہیں۔ عام مسلم قاری اس زہر خورانی کا نہ صرف خوگر ہو گیا ہے؛ بلکہ ان خیالات کی خوراکیں نکل کر فخر و مسرت محسوس کرتا ہے۔ کہیں خدا کی ہستی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور کبھی ایک شریف انسان کو بد معاش ثابت کر دیا جاتا ہے۔ کہیں پیروان مذہب کے کردار کو دوغلا اور کھوٹا بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور کہیں حاملانِ لوائے الحمد کے کرداروں کی خاک اڑائی جاتی ہے۔ ایسے ایسے موضوعات کو منتخب کیا جاتا ہے کہ جن کو پڑھنے سے خدا پرستی اور مذہب سے نفرت و بیزاری پیدا ہو۔ دوسری طرف ان تمام چیزوں کو خوشمنابنا کر شعر و شاعری، صورت گری و افسانہ نگاری میں لایا جاتا ہے جو قرآن کے بیان کردہ حقائق کی روشنی میں محسوس اور غیر محسوس طور پر ضرر رساں ہیں۔ جدید ادب ہر مذہب پسند آدمی پر ”ہملا“ کا لیلبل چسپاں کر کے اُسے سامانِ تہسخر اور ہدفِ تحقیر بناتا ہے اور اس کے ساتھ وہ ان ادبیات کو ترقی پسندی کے مرتبہ پر رکھتا ہے جو ہمارے مذہبی رجحانات سے صریح متصادم ہیں اور جو لوگ اسلامی نظریات، اصول و اقدار کو مجور فکر بنا کر پاکیزہ تعمیری ادب کی تشکیل کرتے ہیں، وہ رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے گنہگار ٹھہرتے ہیں۔ ایسا ادب پڑھنے والے عام قارئین جب سالہا سال سے مخالف قرآن افکار کی زد میں رہتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کی ذہنیت اس سے ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ہمارا جدید ادب بھی تعلق بالقرآن میں ایک دیہیز پردے کی صورت میں حائل ہو گیا ہے۔

۵۔ قرآن جو دنیا پرستی کے مختلف مسالک کے خلاف تحریک اٹھانے کے لیے اُترا ہے، آج مادیت پرستی اور دنیا پرستی کی تیز لہریں اس کے سامنے حائل ہو رہی ہیں۔ صنعتی انقلاب اور سائنسی

ایجادات سے انکار ممکن نہیں، اسی طرح موٹر اور مشین سے کام لینا بھی ضروری ہے؛ لیکن بہ حیثیت حاملِ قرآن جب ہم دیکھتے ہیں کہ دولت و مادیت کا یہ سیلاب اپنے ساتھ بدترین مفسد بھی لا رہا ہے تو یہ صورتِ واقعہ بڑی تشویشناک ہو جاتی ہے۔ اس سیلاب کے ابتدائی ہلکے ہلکے ریلوں کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے پوری قوم کو متنبہ کیا تھا؛ مگر ہماری غفلت سے یہ نہ صرف مزارِ اقبال سے گزر گیا؛ بلکہ اس کی اونچی ہوتی ہوئی لہریں ہمارے سروں پر سے بھی گزر گئی ہیں۔ اس کا عجب کرشمہ ہے کہ ہماری زندگی کا ایک سرا ترقی جبکہ دوسرا سراسر محرومی ہے۔ صنعتی انقلاب نے درمیانے طبقے کو پیس کر رکھ دیا ہے، اس نے طبقاتی تقسیم پیدا کر دی ہے، فرد فرد اور گروہ گروہ کو آپس میں مسابقت اور کشمکش میں لگا دیا ہے۔ ہر شخص پیسے کے حصول کے لیے اندھا دھند توڑ رہا ہے، ذریعہٴ عزت و تحفظ اور تمام اخلاقی قدروں اور انسانی روایتوں کا ٹھیکے دار فقط پیسہ ہی رہ گیا ہے۔ مضمونِ حیات کا اب یہی عنوانِ واحد بچا ہے۔ بینکوں، کاروں، کوٹھیوں، بھاری کارخانوں، محل نما ہوٹلوں اور بھاری بھرکم طیاروں کے درمیان گھرا ہوا انسان اپنے آپ کو بے وقعت محسوس کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کا سارا وقت اور سارا قویٰ دولت نے اس طرح جذب کر لیا ہے گویا اب یہی ان کا خدا ہے۔ اب ترقی کا وہ متوازن تصور ذہنوں سے غائب ہو رہا ہے، جس میں معاشی و اخلاقی ترقی اور جسم و روح دونوں کی فلاح شامل ہو۔ ایمان، مذہب، روحانیت اور اخلاقیات کی باتیں گویا اب مانع ترقی ہیں۔ اب ہر وہ شخص پاگل، بے وقوف اور قدامت پرستی کا مریض سمجھا جاتا ہے جو مادی ترقی کے ساتھ روحانی و اخلاقی ترقی کا متوازی طور پر جاری رہنا ضروری قرار دیتا ہے مادیت پرستی اور پیسے کی اس دوڑ نے توجیہ الی القرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

۶۔ مذکورہ ردائل کے ساتھ ایک انتہائی خطرناک، عدم توجہ الی القرآن کے لیے مؤثر کن ”بدن پرست ثقافت“ حریم امت مسلمہ بن گھس آئی ہے۔ وہی ثقافت جس نے مغربی انسانیت کو گھن کی طرح کھا ڈالا ہے۔ گندی فلمیں شراب و کباب، رقص و سرود، میلے ٹھیلے، مخلوط تقاریب، ہوٹل بازی، مخلوط نظامِ تعلیم، بدنکاہی و آوارگی، ننگی تصاویر، خواتین کی بے پردگی اور تنگ لباسی، کپڑوں اور بالوں کے فیشیوں کی وبا، فحش و عریاں سائن بورڈ، ہر بڑے چوک پر لگی خواتین کے نیم برہنہ فوٹوز وغیرہ۔ حجاب سے اظہارِ بیزاری، شہوت انگیز فلمیں و ڈرامے، نشہ آور ادویات، کاروباری اداروں میں گاہکوں کی توجہ کے لیے لڑکیوں کا تقرر، ان سارے امراض کے ساتھ پھر فیملی پلاننگ کی مقدس تعلیم کو عام کرنے کے لیے میڈیا کا آزادانہ استعمال۔ یہ سب کچھ اسلام کی ثقافت نہیں کہلا سکتا

اور کوئی بھی تاویل اس رنگِ ثقافت کو 'نصیحتہ اللہ' قرار نہیں دے سکتی۔ کوئی شخص، خاندان یا معاشرہ مغرب کی اس ثقافتِ فسق و فجور میں مبتلا ہو کر فہمِ قرآن اور تدبیرِ قرآن کی طرف مائل نہیں ہو سکتا اور سچ یہ ہے کہ اس کے لیے حقائق و معارف کے دروازے ہی بند کر دیے جاتے ہیں۔

۷۔ ہمارے ہاں کے مذہبی اداروں اور دین کی نمائندگی کرنے والے علماء میں سے تھوڑی سی مقدار کے استثناء کے ساتھ بقیہ حضرات چھوٹے چھوٹے فروعی اور فقہی مسائل پر آپس میں نبرد آزما ہیں۔ مسجد و محراب سے آیات و احادیث پڑھ کر ایک دوسرے پر یکجہرا اچھالی جاتی ہے۔ غضب آلود تقریروں کے جھکڑ چلتے ہیں اور تکفیر و تفسیق کا غبار اڑایا جاتا ہے۔ دنیا کو حسنِ کلام، آدابِ گفتار اور طریقِ اختلاف سکھانے والے غیر شائستہ لب و لہجہ اختیار کر کے خود اپنا وقار خراب کرتے ہیں۔ ان سطحی مناظروں اور فضول بحثوں نے عوام کو قرآن کے سادہ اور عام فہم حقائق سے دل برداشتہ کر دیا ہے اور پڑھے لکھے لوگ ان ہنگامہ آرائیوں سے متنفر ہو کر سرے سے دین سے ہی دور ہو جاتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے حاملینِ قرآن عوام و خواص کے لیے قرآن فہمی میں حائل ہو جاتے ہیں اور وہ بڑے بڑے مقاصد کے سامنے ہوتے ہوئے بھی چھوٹے چھوٹے جزئی اور فروعی امور میں ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں۔

یہ وہ رکاوٹیں ہیں جنہوں نے قرآن کریم کو فہم و در فہم قلعے میں محصور کر دیا ہے۔ اب جو شخص قرآن تک پہنچنا چاہے اس کے لیے ان فیصلوں کو پار کرنے کا کٹھن مرحلہ سر کرنا ضروری ہے۔ شعورِ قرآن کے عام ہونے اور غلبہِ قرآن کے کامیاب ہونے کا دور وہ ہوگا جب قرآن کو اس فہم و در فہم قلعے سے باہر نکالا جائے گا۔

اگر ہماری اپنی پیدا کردہ رکاوٹیں درمیان میں حائل نہ ہوں تو قرآن مقدس کی تعلیم کا مرکزی نقطہ نظر نہایت جامع، نہایت مختصر آسان فہم اور بہت سادہ ہے جو تین بنیادی باتوں پر مشتمل ہے:

(۱) ساری کائنات کا خالق و مالک فقط اللہ جلّ جلالہ ہے، اس کی کسی کے ساتھ شراکت داری نہیں۔ دنیا اس نے بنائی اور وہی اس کائنات کو ختم کرے گا۔ انبیاء، رسل، فرشتے، کتب سماویہ، جنت، جہنم اور تقدیر سب برحق ہیں۔ سجدہ اور عبادت کے لائق فقط وہی ذات ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

(۲) حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول اور بندے ہیں۔ آخری نبی ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ نے آخری شریعت دے کر بھیجا۔ نبی کریم ﷺ کے تمام حکموں کی اطاعت اور فرمانبرداری ایک مسلمان

کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ سمیت تمام امورِ دین میں نبی کریم ﷺ کے حکموں کو پیش نظر رکھنا تدبیرِ قرآن کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۳) اسلام کا حکم ہے: لَا يَرْحَمُ اللَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔ خالق کائنات (جل جلالہ) کی عبادت، وجہ تخلیق کائنات (ﷺ) کی اطاعت کے بعد قرآن کریم کی آیات کا معانی و مفہوم مخلوقِ خدا کی خدمت ہے۔ چنانچہ مظلوم لوگوں کی دادرسی، بے کسوں کی مدد، مظلوموں کی نصرت اور لاوارثوں کی کفالت وہ مستحسن امور ہیں جن کی قرآن مقدس نے جگہ جگہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ پس وہ انسان دونوں جہانوں میں کامران ہو گیا جس نے قرآن کریم کی آیات میں غوطہ زن ہو کر اس کے اسرار و رموز اور معانی و مطالب کو پالیا اور خائب و خاسر ہوا وہ شخص جس نے قرآن کریم کی نورانی تعلیمات سے کنارہ کشی اور روگردانی کی۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
ہم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر



مسائلِ کلامیہ کے باب میں مصنفاتِ امامِ نانوتویؒ استفادہ کا منہاج

از: ڈاکٹر مولانا فخر الاسلام مظاہری علیک
ایم۔ ڈی میڈیسن،
پروفیسر احمد غریب یونانی میڈیکل کالج اکل کوٹ

حضرت شیخ الہند کی اُسی تحریک و ہدایت سے، جس میں حضرتؒ نے طالبانِ حقائق اور حامیانِ اسلام کو فہمائش کی ہے کہ ”تائید احکامِ اسلام اور مدافعتِ فلسفہ قدیمہ و جدیدہ کے لیے حضرت خاتم العلماء کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرماویں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریاتِ موجودہٴ زمانہٴ حال کے لیے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر اور بہتر اور مفید تر ہیں یا نہیں“، اسی ہدایت و نصیحت سے متاثر ہو کر تصنیفاتِ نانوتویؒ سے استفادہ کے لیے دل میں ایک تحریض پیدا ہوئی۔

ان تصنیفات کا مطالعہ کرنے پر حضرت خاتم العلماء کی تقریر، تحریر، طرزِ استدلال اور اسلوبِ بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ ان کتابوں میں شبہات و اعتراضات کے کلی جواب ہی نہیں، بلکہ افکارِ حاضرہ کے حوالہ سے جزئیات و فروعات پر، اُن کا اطلاق بھی کیا گیا ہے، اسی طرح علمِ کلام کے حتمی و قطعی اصولوں پر تجزیاتی حیثیت سے نہ صرف سیر حاصل گفتگو موجود ہے؛ بلکہ احوالِ زمانہ کے تحت نئے علوم و فنون سے تعرض کرتے ہوئے، نئے اصول و کلیات کی وضع و تدوین بھی موجود ہے؛ اور ساتھ ہی زمانہٴ قدیم سے جاری و رائج متعین و مسلم اصولِ موضوعہ کی تہذیب و تشکیلِ نو بھی۔

البتہ مطالعہ کے دوران زبان اور اصطلاحات کا مسئلہ ضرور سامنے آیا۔ مولانا نانوتویؒ کی ایک خاص زبان، ایک خاص طرزِ ادا، ایک خاص طریقہٴ تعبیر اور مخصوص اصطلاحات ہیں؛ لیکن

اس کے ساتھ ہی جب اس پر نظر کی، کہ عصرِ حاضر میں زبان کا مسئلہ، ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جو استفادہ میں رکاوٹ بنے؛ کیوں کہ ادب و لسان کے ساتھ ہی علوم و فنون کے تنوع و توسیع، انقسام و انشعاب اور معیارات کے ”طبعی“، ”نفسی“، اور ”روحانی“ تفاوت کو دیکھتے ہوئے، سمجھ میں یہ آیا کہ صحیح قدر اور اصلی اہمیت تو فارمولہ اور اصول کی ہے، اس سے قطع نظر کہ کس زبان میں اور کس تعبیر میں ظاہر کیا گیا ہے؛ کیوں کہ پیش کیے گئے فارمولوں اور اصول سے اگر مقصود حاصل ہوتا ہو یعنی یہ کہ شبہات کو دور کیا جاسکتا ہو، ابہامات کو رفع کیا جاسکتا ہو اور دینی و اعتقادی شبہات جو کہ روحانی امراض ہیں، ان امراضِ متشابہہ کے مابین تشخیصِ فارقہ کی جاسکتی ہو، پھر اس فارمولے کو امثلہ، اجزاء اور خارجی تشکیکاتی حوادث پر منطبق کر کے دکھایا جاسکتا ہو، تو جو شخص یہ کام کر دے زمانہ اس کی قدر کرے۔ رہا مسئلہ تعبیرات و اصطلاحات کا تو اس کا تعلق متعلقہ علوم و فنون کی واقعیت سے ہے، رہیں مخصوص اصطلاحات تو ان کا فہم و ادراک تصانیف اور صاحب تصانیف سے مناسبت پر موقوف ہے۔ (۱)

تقریر، تحریر، طرزِ استدلال اور اسلوب بیان:

مصنیفاتِ امام قاسم نانوتویؒ کے متعلق یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ علومِ قاسمیہ جو تحریری شکل میں موجود ہیں، وہ بہت دقیق، انتہائی مشکل اور فہم سے بالاتر ہیں؛ لیکن مطالعہ سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ بات علی الاطلاق تمام تصنیفات کے متعلق صحیح نہیں ہے؛ بلکہ بعض کتابوں کی نسبت ہی یہ بات درست ہے کہ وہ بہت مشکل ہیں، پھر ان مشکل کتابوں کے متعلق بھی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابوں کے مخاطب امام نانوتویؒ کی تعلیم و تربیت میں رہے ہوئے ذہین، ذی استعداد و مخصوص تلامذہ اور علوم و فنون میں کمالِ درک رکھنے والے علماء ہیں۔ یہ ایسے حضرات ہیں جو روحانیات، وجدانیات، علومِ ظاہرہ و باطنہ اور علومِ مکاشفہ و معاملہ کے ماہر ہیں اور جن کے سامنے ایک طرف بوعلی سینا کا نہ صرف فلسفہ، شفا اور اشارات؛ بلکہ القانون کے مضامین بھی بالکل پامال تھے، دوسری طرف شیخ الاشراق کی اشراقی روحانیت دستِ بستہ معذرت خواہ تھی، جن کے براہینِ قاطعہ کے سامنے صحیفہٴ فطرت کے راز ہائے سرِ بستہ سے پردہ اٹھانے والے، خود اپنے وضع کردہ فطری قوانین پر نظرِ ثانی کرنے یا کم از کم اُن کے ”ضروری“ ہونے کے دعویٰ سے دست کش ہونے کے لیے مجبور تھے (۲)، وہ ”مطالبِ عالیہ“ اور ”معارج القدس“ کے عبور کرنے کے ساتھ ساتھ ”منقذ من الضلال“ سے آگاہ تھے؛ اسی لیے اُن کے ہاں

ایک طرف ابن العربی کے ”مثالی“، ”ملکوتی“، ”لاہوتی“، انکشافات و تحقیقات کی توجیہات موجود تھیں، تو دوسری طرف مجدد الف ثانی کے وحدۃ الشہود اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے وحدۃ الوجود کے مابین تناقض مرتفع تھا۔

ایسے حضرات کے سامنے جب مولانا محمد قاسم نانوتوی تقریر کرتے یا درس دیتے تو اس وقت افادہٴ علوم کی عجیب شان ہوتی، حسب تصریح حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (۳) ”عجائب وغرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے۔“ ”اس طرح کے مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی نے سنے اور نہ سمجھے۔“ (۴) مولانا تھانویؒ نے یہ حکایت ذکر کی ہے کہ ”ایک صاحب سے جنہوں نے مولانا موصوف اور حضرت حاجی صاحب کا درس مثنوی سنا تھا، کسی نے پوچھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حاجی صاحب کے مثنوی پڑھانے میں کیا فرق ہے؟ کہا کہ حضرت حاجی صاحب تو مثنوی پڑھاتے تھے اور مولانا نہ معلوم کیا پڑھاتے تھے۔“ (۵) درس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ نے یہ صراحت کی ہے کہ جب خواص اہل فہم کو درس دیتے تھے تو ”جو شخص طباع اور پہلے سے اصل کتاب سمجھا ہوا ہو، تب مولوی صاحب (امام نانوتویؒ) کی بات سمجھ سکتا تھا۔ حضرت شیخ الہند جو حضرت امام قاسم نانوتویؒ کے تین نہایت ممتاز شاگردوں میں سے ایک ہیں (۶)، کا بیان کردہ یہ واقعہ بھی اہمیت کا حامل ہے جس کے راوی مولانا مناظر حسن گیلانی ہیں، وہ کہتے ہیں ”آدمی اپنے تجربہ اور مشاہدہ کا کیا کرے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن فرمایا کرتے تھے کہ ”دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں حاضر ہوتا اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحب کے کتب میں مشکل ہوتی تھیں“؛ لیکن ”شاہ صاحب کی کتاب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا حضرت نانوتویؒ اول ہی دفعہ میں فرما دیا کرتے تھے۔“ (۷) علوم کی یہی شان شاگردوں کو لکھے مکاتیب میں جھلکتی ہے، مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ فرماتے ہیں:

”چوں کہ آپ کے تلامذہ نہایت ذکی اور صاحب علم تھے؛ اس لیے ان کے نام صادر ہونے والے مکاتیب نادر مضامین پر مشتمل ہوتے تھے؛ مگر ساتھ ہی نہایت مختصر اور بے حد دقیق بھی ہوتے تھے، یوں سمجھئے کہ صرف اشاروں میں باتیں ہوتی تھیں۔“ (۸)

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ علومِ قاسمیہ کے دقیق و مشکل ہونے کی جو شہرت ہے، وہ بے حقیقت نہیں ہے؛ کیوں کہ جہاں تک تصنیفاتِ امام نانوتویؒ کے مشکل ہونے کی بات ہے، تو

اس میں شک نہیں کہ بعض کتابیں یقیناً بہت زیادہ دقیق بلکہ اَدق ہیں۔ ان میں پہلا نمبر ”آب حیات“ کا ہے، جس کے متعلق سنایا گیا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے مصنفِ علام سے سبقاً سبقاً پڑھی؛ اور یہ بھی سنا گیا کہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے یہ کتاب چودہ مرتبہ پڑھی۔ (۹) اس کے علاوہ اَدق ترین کتابوں میں ”قبلہ نما“ ہے، جس کے متعلق مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ ”آخر کے تین رُبع بے حد مشکل ہیں..... حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب نے اس کی قابلِ قدر خدمت کی ہے؛ مگر اس سے کما حقہ کتاب حل نہیں ہوئی۔“ اَدق کے بعد نمبر دقیق کا ہے، حضرت نانوتویؒ کی دقیق کتابوں میں ”تقریر دل پذیر، براہین قاسمیه، مکاتیب قاسم العلوم، الخط المقسوم من قاسم العلوم“ شامل ہیں۔ ان دقیق کتابوں میں علومِ عالیہ اور حکمتِ قاسمیه جس شکل میں محفوظ ہیں، اُسے ایک بلیغ تمثیل کے پیرایہ میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے ظاہر فرمایا ہے کہ ”یہ حکمت ایک ایسے عظیم اور زرخیز ملک کی مانند ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات نہایت ہی منظم طریق پر مہیا ہوں اور خزان و دفائن کی کمی نہ ہو، وسائلِ نقل و حرکت سب جمع شدہ ہوں؛ مگر ملک میں پہنچنے کا راستہ گم، نہایت پیچیدہ اور دشوار گزار ہو، نہ راستہ کے نشانات ہوں جن سے کوئی راہ قطع کر سکے، نہ علام و آثار ہوں، جن سے ملک کی زرخیزی اور آبادی کا پتہ چلتا ہو کہ نفع اٹھانے والے اُس کی طرف متوجہ ہوں اور سوائے مخصوص باخبر لوگوں کے، عامۃ الناس میں نہ کوئی اس ملک سے باخبر ہو، نہ اس میں پہنچ سکنے کی راہ پاتا ہو؛ ٹھیک اسی طرح حکمتِ قاسمیه کے علوم و معارف کے بھرپور خزانوں کا ایک ملک ہے؛ مگر اُس تک پہنچنے کے نشاناتِ راہ، عنوانات، مضامین، ضروری تشریحات، فٹ نوٹ، علوم کی فہرستیں اور تراجم وغیرہ نہ ہونے کے سبب عامۃ علماء بھی اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ تابعوام چہ رسد“ (۱۰) لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ نہ صرف ان دقیق و اَدق کتابوں میں؛ بلکہ امامِ مکتبہ دہلویؒ کی تمام تصنیفات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ خواص علماء جو ان تصنیفات سے مستفید ہوتے ہیں، وہ ان کتابوں میں پائے جانے والے علوم و حکم، دلائل و نتائج کے متعلق یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں:

”مقدمات کی ترتیب طبعی، کہ اہم سے اہم نتائج گویا خود بخود نکلنے کے لیے ابھر رہے ہیں، تقریر استدلالی، نہایت مرتب جو ذہن کو اپیل کرتی ہو، اس کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور ساتھ ہی حضرت والا کا شاخ و درشاخ بیان مسئلہ کے تمام شقوق و جوانب پر اتنا حاوی اور اس کے تمام گوشوں کا اس درجہ واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیر بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا

بلکہ اس کے سیکڑوں امثال جو اُس کی زد میں آجائیں خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں، اس اصولی طرزِ بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں؛ بلکہ قلوب پر کتنے ہی علوم و معارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں، جن سے نئے نئے مسائل کا راستہ بھی ہموار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزئیہ کی پشت پر عقلی کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے اور کتنے عکس اور عقلی اصول اس ایک جزئیہ میں اپنا عمل کر رہے ہیں جس سے وہ عقلی ہی نہیں، طبعی نظر آنے لگتا ہے۔ بقول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب (اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) کہ حضرت والا (امام قاسم نانوتویؒ) کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی؛ اس لیے بلا اختیار ان کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آسکتی تھیں، جس سے ان کے ہاں جزوی مسائل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا۔ اور اس سے وہی ایک جزئیہ نہیں؛ بلکہ اس جیسے سیکڑوں جزئیہ حل ہو جاتے تھے، اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کھل جاتا تھا، جس سے اس جزئیہ کا نشوونما ہوا ہے۔“

”بہر حال شرعی جزئیات کو ان کے عقلی کلیات کی طرف راجع کرنا اور کلیات سے نادر جزئیات اور مقاصدِ دین کا استخراج کر لینا، یا متعدد جزئیات کے تتبع و استقرا سے ایک کلی اصول قائم کر کے ہزاروں جزئیات کا اس سے فیصلہ کر دینا، آپ کا خاص علم اور علم کا خاص امتیازی مقام ہے۔“ (۱۱)

یہ تو وہ علومِ عالیہ ہیں جن کے مخاطب خواص علماء ہی ہو سکتے تھے؛ لیکن ان کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کے ایک قسم کے علوم وہ بھی ہیں جو احکامِ اسلام کی صیانت، ضروریات و معتقداتِ دین کی حفاظت اور غیروں کے حملہ کے مقابلہ میں اسلام کے دفاع کے نقطہ نظر سے مدوّن ہو چکے ہیں، اور ان علوم کی شان یہ ہے کہ وہ علماء کے لیے جس طرح عہدِ قاسمی میں مفید تھے، اسی طرح آج بھی نہ صرف مفید ہیں؛ بلکہ ان کی ضرورت آج کے دور میں زیادہ بڑھ گئی ہے؛ کیوں کہ آج منطقی جواب، عقلی استدلال اور قطعی اصولوں پر مبنی نتائج ہی لوگوں کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے امام نانوتویؒ کے یہ علوم اسلام کا حفاظتی آئینہ قلعہ ہیں اور خواص اور علماء کے لیے مولانا تھانویؒ کی صراحت کے مطابق نہایت درجہ مفید اور ضروری ہیں۔ (۱۲)

اسی کے ساتھ ایک قسم کے علوم وہ بھی ہیں جو مواعظ و خطابات کے حوالہ سے جانے جاتے ہیں، ان کی افادیت عجیب ہے۔ حسب تصریح مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، افکار کی اصلاح، عقائد

و خیالات کی تصحیح کے تعلق سے ”سہارنپور، دیوبند، میرٹھ خورجہ، رامپور، شاہجہاں پور، روڑکی وغیرہ میں سننے والوں کو خطاب و بیان کے جس ملکہ فائقہ کے مسلسل تجربات ہوئے، اُن ہی کی بنیاد پر ارباب علم و بصیرت میں مشہور ہو گیا تھا کہ ”مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح القدس کی تقریر ہو رہی ہے۔“ (۱۳) ”آپ اپنی تقریروں میں مؤیدِ بروح القدس تھے، اس کا اندازہ شاہ جہاں پور کے میلہ خدا شناسی میں اُس صورت میں ہوا جب ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے ادیان و مذاہب کے ہزار ہا افراد کو دیکھا گیا تھا کہ سننے والوں پر ”ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کے مولوی صاحب کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سننے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت۔“ پادریوں کی یہ حالت تھی کہ بے حس و حرکت، ایک پادری ایسے موقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

”اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص (یعنی مولانا نانوتویؒ) کی تقریر پر ایمان لے آتے۔“ اور کسی نے یہ بھی کہا: ”ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا، کوئی اوتار ہوں تو ہوں۔“ (۱۴)

ہماری بات مسائلِ کلامیہ کے باب میں امام قاسم نانوتویؒ کی تصنیفات کے متعلق چل رہی تھی کہ وہ مقتضیاتِ عصر کے تحت حالاتِ حاضرہ میں بہت مفید ہیں، اس حوالہ سے مولانا عتیق الرحمن عثمانیؒ کی بات بہت اہم ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ”جن خوش نصیب افراد کو آپ کی تصنیفات اور خصوصاً ”حجۃ الاسلام، آبِ حیات اور تقریرِ دل پذیر“ وغیرہ کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور انہوں نے ان گوہر ہائے آبدار کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کی سعادت حاصل کی ہے، وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ مولانا مرحوم نے ان تصنیفات میں اسلام کو اور اس کی اصولی اور بنیادی تعلیمات کو ایسے ٹھوس اور ناقابلِ ردِ عقلی اور مشاہداتی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کوئی سلیم الطبع اور متلاشی حق انسان اسلام کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کرنے سے اِبا نہیں کر سکتا۔“ وہ مزید لکھتے ہیں:

”مولانا نانوتویؒ کی تحریروں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ بڑے بڑے فلاسفہ کے اقوال کا حوالہ دیتے ہیں، نہ کتابوں کی عبارت نقل کرتے ہیں اور نہ غیر مسلموں سے گفتگو کرتے ہوئے قرآن وحدیث کا ذکر درمیان میں لاتے ہیں؛ بلکہ خالص مشاہداتی اور محسوساتی امور کو جن کا کوئی شخص انکار ہی نہیں کر سکتا اور جو مسلماتِ عام کی حیثیت رکھتی ہیں، اُن کو آپ اپنی گفتگو کا اصول

موضوعہ بناتے ہیں اور پھر اسی پر اپنے دلائل و براہین کی بنیاد قائم کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ (۱۵)

درحقیقت مولانا نانوتویؒ کا طرزِ بیان اور اسلوب یہی ہے، حتیٰ کہ حمد و ثنا سے کتاب کی ابتدا کرتے ہیں تو یہی استدلالی وصف دعوتی رنگ لیے ہوئے نمایاں ہوتا ہے۔ بطور نمونہ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

”ہزاروں حمد و سپاس اُس خالقِ بے چوں کو کہ جس نے عالم کو بنایا اور اس میں بنی آدم کو ربّہٴ اعلیٰ عطا فرمایا۔ ہزار ہا نعمتیں عطا فرما کر سب سے بڑی ایک وہ نعمت دی کہ جس کے باعث سب کائنات سے اشرف ہوا۔ وہ کیا ہے؟ ایک جو ہر بے بہا، عقلِ با صفا ہے کہ حق و باطل، نیک و بد، نفع و نقصان کے جاننے پہچاننے کے لیے ایسا ہے، جیسا سیاہ و سفید، زرد و سرخ، عرض و طول، اچھی بری شکل و صورت کے دریافت کرنے کے لیے آگ کی چمک، یا چاند، سورج، ستاروں کا نور ہے۔ مگر عجب اس کی قدرت کی نیرنگی ہے کہ ہر چیز کا ایک جدا رنگ ہے اور ہر شئی کا نیا ڈھنگ ہے۔ ہر ایک صورت جدا، سیرت جدا۔ کوئی اچھی، کوئی بری۔ کوئی کم، کوئی زیادہ، نہ کم زیادہ ہو سکے، نہ زیادہ کم ہو سکے، نہ اچھا برا، نہ برا اچھا۔ الغرض! عالم کو مختلف بنایا، تا (تاکہ) اُس کی قدرت اور اپنی بے اختیاری پر گواہی دیں۔ اسی طرح عقل میں سب کو متفاوت بنایا اور دانش و فہم میں اہل فہم کو مختلف پیدا کیا۔ سو جو باتیں کم فہموں سے رہ جاتی ہیں، اُس (ان) کو کامل عقل والے حل کرتے ہیں۔ اور جہاں کج فہم بچکتے ہیں، وہاں سے سیدھی عقل والے سیدھے نکلتے ہیں۔ اور اوروں کو سنبھالتے ہیں، اور آپ سنبھلتے ہیں۔

سو ہزاروں رحمتیں اُن کی جانِ پاک پر، کہ آپ بچے اور اوروں کو بچایا اور بھکے ہوؤں کو سیدھا راستہ دکھایا، خصوصاً اُس پر کہ جو ان سب میں بمنزل آفتاب کے ستاروں میں ہو۔ اور اُس پر، جو اس کے پیروؤں اور یاروں میں ہو۔ (۱۶)

خالق کی معرفت کے لیے دعوتِ فکر دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اس کے بعد گنہ گار، شرم سار، ہیچ مداں بندہ خیر خواہِ خلاق، سب ہندو، مسلمان، یہود، نصاریٰ، مجوس، آتش پرست کی خدمت میں بہ نظرِ خیر خواہی اپنے چند خیالات پریشان کو جمع کر کے عرض کرتا ہے اور امیدوار ہے کہ سب صاحب اپنے تعصبِ مذہبی اور جی لگی باتوں کی محبت سے الگ ہو کر میری بات کو سنیں۔ اگر پسند آئے، قبول کریں، نہیں تو اصلاح فرمائیں۔ پر (لیکن)

ایک بار اول سے آخر تک دیکھ جائیں۔ اور بے سب دیکھے حرف گیر نہ ہوں، کہ شاید پہلی بات کا ثبوت آخر میں نکلے اور آخر کا اول سے کام چلے۔

مگر شدتِ تعصبِ اہل زمانہ اور ہر کسی میں خواہش کی پیروی کو دیکھ کر یوں ڈرتا ہوں کہ حسبِ مثل مشہور: ”نیکی برباد، گندلازم“ مجھے کیا کیا کچھ نہ کہیں گے۔ کوئی دیوانہ بتائے گا، کوئی خطبی بتائے گا؛ مگر مجھے کسی سے کیا کام؟ اپنے کام سے کام۔“ (۱۷)

ماقبل میں مولانا عتیق الرحمن عثمانی کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا نو توویؒ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فلسفہ کی اصطلاحات اور علومِ عقلیہ کا بوجھ پڑھنے والے پر نہیں ڈالتے؛ چنانچہ مثالیں بہت آسان زبان میں روزمرہ بول چال کے مطابق اور رواج میں استعمال ہونے والے الفاظ و محاورہ میں سمجھاتے ہیں۔ (۱۸) اور ایسے مسلمات سے گفتگو کرتے ہیں جو بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات ہوتے ہیں، لیکن ان مسلمات کا استعمال کرنا ہر ایک کو نہیں آتا، مثلاً ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”جو بات بے دلیل عقلِ غالب کے نزدیک مسلمہ ہوتی ہے، جیسے دودنی چار، اس کے خلاف پرسودِ لیلیں بھی ہوتی ہیں، تو اس پر، ورنہیں ہو سکتیں۔“ یعنی غالب نہیں ہو سکتیں۔ پھر اس بے دلیل والی دلیل سے ایک طرف تو عقیدہٴ تثلیث کو باطل کیا۔ (۱۹) اور دوسری طرف آسمان کا ممکن الزوال ہونا، ثابت کیا۔ (۲۰) پھر یہی نہیں؛ بلکہ آسمان کا خرق و التیام اور ممکن الزوال ہونا ثابت کرنے کے بعد؛ دیکھیے کس انداز سے فہمائش کرتے ہیں:

”جناب من! دلائل سے اگر آسمان کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا کوئی محال ہونا ثابت کرے، تو بعد اس کے کہ اس کا ممکن ہونا آفتاب کی طرح دانشمندوں کے لیے واضح ہو چکا ہے.....، اس اپنے نہ جانے، اپنی بے وقوفی اور بے علمی کی وجہ سے اس بات کے غلط ہونے میں متامل نہ ہوگا۔ اسی طرح جب یہ واضح ہو گیا کہ ماسوا موجود اصلی کے، جو خداوند کریم کے (سوا) اور کوئی نہیں، سب کا وجود عارضی ہے، تو بے وقوف سے بے وقوف بھی اس بات کو سمجھ کر اس (آسمان) کے زوال کے ممکن ہونے میں ہرگز متامل نہ کرے گا۔ پھر اگر افلاطون بھی زمین سے نکل کر آئے اور ہزاروں دلیلوں سے اس بات کو ثابت کرے کہ آسمان کے وجود کا زائل ہو جانا اور اس کا معدوم ہونا محال ہے، تو گو (ایک عام آدمی ’بیوقوف سے بیوقوف بھی‘ جو) ان دلیلوں کو نہ جانتا ہو؛ بلکہ ان کے سمجھنے کی بھی لیاقت نہ رکھتا ہو، یونہی کہے گا کہ ان دلیلوں میں کچھ نہ کچھ قصور ہے۔“

مثالیں آسان دینا، اصطلاحات کا بوجھ نہ ڈالنا، ایسے محسوسات و مشاہدات کو اصول موضوعہ بنا کر گفتگو کرنا جو مسلمات عام کا درجہ رکھتے ہوں، امام المتکلمین کے یہ خاص کلامی اوصاف ہیں۔ پھر آسان مثالوں کا یہ معیار جس کا نمونہ ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا، مشکل دلائل دیتے وقت بھی قائم رہتا ہے، تحریر ذیل ملاحظہ ہو:

”جس کا رخانے کو دیکھیے، ایک اصل پر قرار ہے۔ نورِ آفتاب کو دیکھیے تو ہزاروں مکانوں اور ہزاروں روشن دانوں میں جدا جدا جلوہ دکھلا رہا ہے، پر آفتاب کو سب کے ساتھ رابطہ ہے، عدد کے سلسلہ کو نظر کیجیے تو اول سے الی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے، کہیں دو ہیں، کہیں تین، کہیں چار، کہیں پانچ، کہیں دس، کہیں بیس، کہیں سو، کہیں ہزار، علیٰ ہذا القیاس۔ اور اس پر کہیں جذر کہیں مجذور، کہیں حاصل ضرب، کہیں مضروب، کہیں مضروب فیہ، کہیں حاصل قسمت، کہیں مقسوم، کہیں مقسوم علیہ وغیرہ؛ پر سب کی اصل وہی ایک ہے۔“

”موجوں اور بلبلوں کے کارخانوں کو دیکھیے تو سب کی اصل وہی ایک پانی ہے، شاخوں کو دیکھیے تو سب کی اصل جڑ ہے، آدمی وغیرہ کو دیکھیے تو سب ایک اصل میں جسے انسانیت وغیرہ کہیے، مشترک ہیں۔ اسی طرح جس طرف نظر پڑتی ہے کوئی ایسا کارخانہ دیکھا نہیں جاتا کہ جس کا کوئی سرّ منشا نہیں۔ پھر ان سرّ منشاؤں کو دیکھیے تو ان کا کوئی اور سرّ منشا ہے اور اسی طرح اوپر تک چلے چلو..... سارے عالم میں وجود کا اشتراک ہے، پر چوں کہ شئی مشترک عین اشیاء متعدّدہ نہیں ہو سکتی تو (شئی مشترک اصل واحد ہی رہے گی، اس میں تعدد بھی نہیں ہو سکتا اور۔ ف) تعدد کیوں ہو! (اس لیے کہ شئی مشترک تو ایک اصل ہے، اس کا جلوہ ہزاروں اشیاء تک پہنچے گا اور وہ اصل واحد ہی رہے گی، لہذا۔ ف) یوں سمجھ میں آتا ہے کہ وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں۔“ (۲۱)

حضرت مولانا نانوتویؒ کی یہی خوبی ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ کو اس قدر سادہ طریقہ سے سمجھا دیا کہ اس کے مشکل ہونے کا احساس بھی نہ ہونے دیا، ورنہ یہ بالکل حقیقت ہے کہ حضرت نے ان مثالوں سے جس بڑے مسئلہ کو حل کیا ہے، وہ ایسا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے کہ اس کے سمجھ لینے سے نہ معلوم کتنے مسئلے حل کرنے کی کلید ہاتھ آ جاتی ہے؛ چنانچہ یہیں سے شاید وہ دقیق مسئلہ بھی حل ہو جائے جس کی تفہیم ہمیشہ مشکل رہی ہے، اور جس کی گرہ نیم باز غالباً اب تک وائیں ہو سکی ہے۔ مسئلہ، باری تعالیٰ کی صفت سے تعلق رکھتا ہے جس کا اصطلاحی عنوان ”لا عین ولا غیر“ ہے۔ ہم مسئلہ کے لیے نور بصیرت حاصل کرنے کی خاطر ایک طرف تو مولانا نانوتویؒ کی عقل و حکمت پر مبنی مذکورہ

وضاحت کو پیش نظر رکھیں، اور گرہ نیم باز کو کھولنے میں ناحین اشرف کا استعمال کریں، یعنی اس تحقیق کا اطلاق کریں جو حکیم الامت کی زبان فیضان حق سے مظاہر علوم میں علماء و طلباء کے مجمع میں بیان کی گئی ہے (۲۲)، جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: ”قرآن یعنی کلام لفظی بدرجہ کلام نفسی بنا بر تحقیق متکلمین حق تعالیٰ کی صفت ذاتیہ نہ ہو؛ مگر ذات حق سے اس کو ایسی نسبت ہے، جیسے شعاع کو آفتاب سے، پس ایک قرص آفتاب ہے کہ وہ اس کی ذات ہے، دوسری اس کی صفت نور جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، تیسری شعاع، چوتھی زمین منور۔ یہ شعاع نہ تو نور قائم بالشمس کی طرح ہے، نہ شمس سے متصل ہے اور نہ زمین کی طرح شمس سے بالکل منفصل۔“

”اسی طرح کلام لفظی نہ صفات ذاتیہ کی طرح ذات کے ساتھ قائم اور نہ دوسرے حوادث کی طرح بعید التعلق؛ بلکہ باوجود حادث ہونے کے دوسرے حوادث سے زیادہ شدید التعلق، اور اسی شدت تعلق کے سبب اس کو کلام اللہ کہا جاتا ہے؛ دوسرے کلام حادث کو کلام اللہ نہیں کہا جاسکتا۔“ (۲۳)

یہ تو باری تعالیٰ کی ایک صفت یعنی کلام اللہ کی بات تھی؛ لیکن کل صفات بھی چوں کہ لایعین ولا غیر ہیں، لہذا مولانا تھانویؒ کی مذکورہ تمثیل میں صفات ذاتیہ کی مثال شمس کی مذکورہ تمثیل میں ”نور“ سے ہو جائے گی، جس کو حضرت مولانا نانوتویؒ نے دوسری تحریروں میں حل فرمایا ہے، وہاں ملاحظہ کرنا چاہیے۔ یہاں پر تو مقصود ذکر یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے وجود و عدم سے متعلق جو کلیہ قائم کیا ہے اور اس کے تحت جو مثالیں ذکر کی ہیں، ان میں صرف یہی خوبی نہیں ہے کہ وہ مخاطب کے نزدیک بھی ثابت شدہ اور مسلم ہیں؛ اور یہ کہ صالح کا موجود اصلی ہونا ان سے ثابت ہو جاتا ہے؛ جیسا کہ آگے چل کر ثابت کیا بھی گیا ہے؛ بلکہ یہ کلیہ ایسا مفید، مؤثر اور مضبوط ہے کہ جو ہلائے نہیں ہلتا اور کبھی نہیں ٹوٹتا اور پچاسوں (۲۴) مسئلے اسی ایک کلیہ اور اس کلیہ کے تحت مذکور امثلہ سے ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (۲۵)

چند مثالیں جن سے بہت سے محققے اور مسئلے اسی کلیہ سے حل ہو جاتے ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ کے اعجازی الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

”القصة! اشتراك وجود کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ وجود عالم اور عالم میں فرق ہے، یہ دونوں بالکل ایک شئی نہیں؛ بلکہ وجود عالم ایک خارجی چیز ہے اور ایک عارضی شئی ہے، اصلی اور ذاتی نہیں؛ اور جب وجود عالم عارضی اور خارجی اور مستعار ٹھہرا، اصلی اور ذاتی نہ ہوا، تو ہم بہ قیاس

اس بات کے کہ جیسے گرم پانی کی گرمی، جو عارضی، خارجی، مستعار ہے، آگ کی عطا کی ہوئی ہے، جس کی گرمی اصلی اور ذاتی ہے؛ یا جیسے قلعی دار آئینے کا نور، جو آفتاب کے مقابل ہو، اصلی نہیں؛ بلکہ آفتاب کا فیض ہے، جس کا نور اصلی اور ذاتی ہے، بالیقین یوں سمجھتے ہیں کہ ایسے ہی عالم کا وجود، جو اصلی اور ذاتی نہیں، ایک شئی عارضی ہے، کہیں خارج سے ایسے موجود سے ملا ہوگا جس کا وجود اصلی ہوگا، وہ بجز صانع کے، اور کون ہے۔“ (۲۶)

پھر وجود کی اسی تحقیق و تفہیم سے وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا جو علم کلام کے اس امام زمانہ کے ہی عہد میں بعض خاص گروہ کی طرف سے پیش ہوا تھا۔ یہ گروہ مادہ کے قدیم و غیر مخلوق اور مادہ میں خدائی صفت کے حلول کا قائل تھا اور خدا کی ماہیت کے حوالہ سے کہتا تھا کہ ”خدا کی صفات کی تعداد نہیں، سب اکٹھی ہوں تو خدا ہو.....“ (۲۷)

مذکورہ گروہ کی طرف سے پیش کیے گئے اس اشتباہ کو رفع کرنے کے لیے مصنف براہین قاسمیہ (۲۸) نے اُسی مسئلہ کو بنیاد بنایا ہے، جس کا ذکر اوپر کیا گیا کہ جو عالم میں اور عالم میں فرق ہے۔ ذات اور شئی ہے، وجود اور شئی ہے۔ اور یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ کسی چیز کی صفات و متعلقات تو متعدد ہو سکتے ہیں؛ لیکن اُن صفات و متعلقات کا مدار شئی ہونا ضروری نہیں ہے، ثابت کیا ہے کہ ذاتِ باری کے لیے مدار تو اُس کا وجود اصلی و ذاتی ہے۔ ”خدا اس کو کہتے ہیں جو خود موجود ہو کسی اور کے وجود پر اس کے وجود کا سہارا نہ ہو۔“ (۲۹) ”خدا کی کو سب صفات سے کیا علاقہ“ ”صفات معلول ذات ہوتی ہیں۔ ذات اور مناصب ذاتیہ کو معلول صفات کہیں نہیں سنا تھا۔“ مؤلف براہین قاسمیہ نے پہلے تو یہ دعوے قائم کیے، پھر ان دعوؤں کے ثبوت کے لیے مثالیں ذکر کیں کہ مثلاً:

”سولہ چار کا جذر، دو کا آٹھ گنا، چار کا چو گنا، آٹھ کا دونا، بارہ کا ایک اور ایک ثلث (یعنی ۱۲/۳)..... بھی ہے اور منقسم بہ متساویین بھی ہے۔ (یعنی دو برابر کے حصوں پر بغیر کسر کے تقسیم بھی ہو جاتا ہے) مگر اُس کے زوج ہونے کا مدار فقط انقسام بہ متساویین پر ہے، اور (دوسری) صفات کو اُس سے علاقہ نہیں (یعنی دوسری صفات مذکورہ کا زوج ہونے سے کوئی تعلق نہیں)، ہاں جس کو فہم سے علاقہ نہ ہو اُس کے نزدیک سولہ کی زوجیت کو اور (دوسری) صفات سے بھی علاقہ ہو تو ہو۔

دوسری مثال:

آتش مصدر حرارت ہے، مَؤثر بھی ہوتی ہے، سرخ و سبز بھی ہوتی ہے، نازک و لطیف بھی ہوتی ہے، خشک و آبدار بھی ہے؛ مگر اُس کے آتش ہونے کا مدار اُس کی مصدر حرارت پر ہے

اور صفات پر نہیں۔ ہاں فہم نہ ہو، تو جس کو چاہو اُس کا مدار بناؤ۔

تیسری مثال:

آفتاب گول بھی ہے، گرم بھی ہے، ہم سے ایک فاصلہ پر بھی ہے جس کے سبب کسی سیارہ سے نیچا اور کسی سے اونچا ہے، اور اُس کے ساتھ مصدر النور بھی ہے، مگر سب جانتے ہیں کہ اس کے خورد روشن ہونے اور اوروں (یعنی دوسروں) کے روشن کرنے کے لیے فقط اُس کا مصدر النور ہونا درکار ہے۔ ہاں کوذن، بیوقوف تمام اوصافِ مذکورہ پر اُس کی روشنی اور روشن کرنے کو چسپاں کریں تو کون مانع ہے۔ (اس بے وقوفی کے اظہار کے لیے۔ ف) کو دانش کی زبان اور چھوٹا سا قلم کافی ہے۔

چوتھی مثال:

معشوق لوگ جیسے حسین ہوتے ہیں ایسے ہی اور اوصاف بھی اُن میں ہوتے ہیں؛ مسلمان بھی ہوتے ہیں (۳۰)، کافر بھی ہوتے ہیں، شریف بھی ہوتے ہیں، رذیل بھی ہوتے ہیں اور لالہ لوگوں میں سے بھی ہوتے ہیں، دوسری قوموں میں سے بھی ہوتے ہیں، خوش اخلاق، بد اخلاق، سخی، بخیل وغیرہ بھی ہوتے ہیں، یورپین بھی، ایشیائی بھی، افریقی بھی، امریکی بھی؛ مگر سب جانتے ہیں کہ اُن کے معشوق ہونے کا مبنی اُن کے حسن و جمال پر ہوتا ہے اور اوصاف پر نہیں ہوتا۔ ہاں عقل کو طاق میں اٹھا رکھیے تو پھر جس کو چاہو معشوقیت کا مبنی بنا دو۔

پانچویں مثال:

بادشاہانِ دنیا حسین بھی ہوتے ہیں، کم رو (کم خوبصورت) بھی ہوتے ہیں؛ قوی بھی ہوتے ہیں، ضعیف بھی ہوتے ہیں؛ ہنرمند بھی ہوتے ہیں، بے ہنر بھی ہوتے ہیں؛ ہر قوم کے ہوتے ہیں، ہر ملک کے ہوتے ہیں؛ مگر اہلِ فہم کو معلوم ہے کہ اُن کی بادشاہت اور سلطنت کی بناء اُن کے تسلط پر ہوتی ہے، دوسرے اوصاف کو اُس سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ ہاں عقل کے دشمن جس بات کو چاہیں بناء سلطنت بنا دیں۔

ان چار پانچ مثالوں پر قناعت کر کے اہلِ فہم کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ خدا اُس کو کہتے ہیں جو خود موجود ہو، کسی اور کے وجود پر اُس کے وجود کو سہارا نہ ہو۔ چنانچہ لفظ ”خدا“ خود اس پر شاہد ہے۔

حقیقت شناسانِ عالی فہم تو درکنار، فقط زباں سنج بھی اتنی بات سمجھتے ہیں..... تو، جب خدا اُسی کا نام ٹھہرا جس کا وجود خانہ زاد ہو، مستعار نہ ہو؛ تو پھر ہر ادنیٰ عقل والا بھی اس پر شاہد ہو سکتا

ہے کہ مدارِ خدائی خداوندِ عالم فقط اُس کے غیر مخلوق ہونے پر ہے، دوسری صفات کو اُس سے کچھ علاقہ نہیں۔ ہاں فہمِ بغل میں مار، بُرقعِ حیا کو منہ سے اُتار جو چاہو سو کہہ دو۔..... (ورنہ جو ذرا بھی فہم و انصاف سے کام لیں گے وہ۔ ف) ”علیٰ رؤسِ الاشہاد یہ کہہ دیں گے کہ خدا کی خدائی کا مدار بالبداہت اُس کے غیر مخلوق ہونے پر ہے۔“ (۳۱)

مظاہرِ الآمال کے حوالے سے مولانا تھانویؒ کے ایک خطاب کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے۔ مظاہرِ علوم کے اپنے خطاب میں مولانا تھانویؒ نے حق تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ کے ذکر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ”اور اسی جگہ سے بعض متکلمین نے اس کلامِ لفظی کو بھی قدیم کہہ دیا، گونہوِ اس کا حادث ہو۔ اور مسئلہ دقیق ہے، بلا ضرورت اس میں خوض کرنا بھی جائز نہیں۔“ (۳۲)

جس مسئلہ کی طرف مولانا تھانویؒ نے اشارہ فرمایا اور یہ فرمایا کہ مسئلہ دقیق ہے، پھر اشارہ اور تنبیہ جو فرمائی وہ ۵۰۰ افراد کے اس مجمع میں، کہ جس میں سب کے سب تقریباً خواصِ علماء یا درسیات سے شغف رکھنے والے طلبہ تھے؛ اسی سے مسئلہ کی دقت و نزاکت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے (۳۳)، لیکن اس کے ساتھ ہی مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے جو دہری فلاسفر اور ملحد سائنس دان کی طرف سے علمی و عقلی پیرایہ میں شبہ کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس شبہ کا جواب اور دفاع غالباً مولانا نانوتویؒ کی تحریروں کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔

یہ مسئلہ جو اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ اشیاء کی ذات اور وجود دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، اس کو حضرت امامِ متکلمین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پہلے تو ایک ایسی مثال سے حل فرماتے ہیں کہ وہ مثال خود ایک اصل اور بنیاد بن جاتی ہے، فرماتے ہیں: ”جناب من! جب کوئی معمار مکان بناتا ہے، تو اول اس کا نقشہ ذہن میں جمالیلتا ہے اور پھر بن کر وہ مکان اگر ڈھ جاتا ہے تو دیکھنے والوں کے دلوں میں اس کا نقشہ باقی رہ جاتا ہے۔ اب سنیے! کہ اُس نقشہ ہی سے وہ مکان اور مکانوں؛ بلکہ اور چیزوں سے متمیز ہوتا ہے، سو یہ نقشہ اس مکان کی ذات ٹھہرا (۳۴)، اور یہ حال کہ وہ زمین پر بنا ہوا انکھیروں کو نظر آنے لگا اور اندھوں کے ہاتھوں کو معلوم ہونے لگا اور اس میں آنے جانے والے اٹھنے بیٹھنے لگے، یہ اس کا وجود ہوا۔ سو اب دیکھیے! ذات اس مکان کی، یعنی وہ نقشہ اور شئی ہے اور اس کا وجود اور شئی ہے؛ اور اسی سبب سے وہ دونوں کبھی اکٹھے ہو جاتے ہیں اور کبھی علیحدہ ہو جاتے ہیں، اگر دونوں ایک ہی ہوتے تو علیحدگی نہ ہوتی۔ سو اس بات میں مکان اور، زمین آسمان میں اور، اور موجودات میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا، اُن کا بھی جدا ایک نقشہ ذہن میں آتا ہے اور

وجود جدا۔ فرق ہے تو اتنا ہے کہ کوئی بنا، محکم اور مضبوط ہے، کوئی نہیں۔“

اب اس کے متعلق جو شبہ پیش آسکتا ہے، اُس کا ازالہ کرتے ہیں:

شبہ (۱): ”اس پر شبہ یہ ہے کہ نقشہ بھی تو ایک شئی ہے (جو) بے وجود کے سمجھ میں نہیں آتی، سو اگر نقشوں کے (جو کہ بے وجود سمجھ میں نہیں آتے۔ ف) بھی نقشے ہیں اور اُن کے نقشوں اور وجود میں بھی فرق ہے“ تو یہ تو ایک تسلسل ہے جو محال ہے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ ان (نقشوں) کا وجود اور ذات دونوں ایک ہی ہیں۔

شبہ (۲): دوسرا شبہ یہ ہے کہ جب وجود اور ذات دونوں ایک ہی ہیں تو ان میں اور خدا میں کیا فرق رہا، وہ بھی مثل خدا کے موجودِ اصلی اور موجودِ قدیم ہوئے؟

یہ دونوں شبہ نہایت سخت ہیں جن کے جواب امام نانوتویؒ نے دیے اور چوں کہ حضرتؒ کے ساتھ تائیدِ غیبی اور توفیقِ الہی ہر وقت شامل حال رہی ہے؛ اس لیے جواب بھی نہایت شاندار ادا ہوئے۔ ملاحظہ فرمائیے، خطاب اس طرح سے شروع فرمایا: ”اہل انصاف اگر غور فرمائیں اور میری کم حوصلگی پر نہ جائیں، تو اس بڑی بات کو نامِ خدا، اس چھوٹے منہ سے ادا کرتا ہوں۔“ چنانچہ جو کچھ ادا فرمایا اُس کی رو سے یہ مثال مذکور (نقشہ والی) خود ایک مستقل کلیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے تحت انواع اور جزئیات اور فروعی مسائل آتے چلے گئے ہیں۔ پہلے کلی مسئلہ کی توجیہ چند مثالوں سے فرمائی، جس سے تفہیم میں آسانی ہو جائے، اُس کے بعد تقدیر کے مسئلہ کو ضمناً بطور نتیجہ اور اثر کے، اُسی پر مرتب کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کلامِ لفظی، حروف، نقوش سب اپنے ظہور کے اعتبار سے حادث ہونے کے بعد بھی خدا کے علمِ تفصیلی کی معلومات ہونے کی حیثیت سے موجوداتِ پنہانی ہیں اور وہ علمِ تفصیلی قدیم ہے اور اس علمِ تفصیلی کے لیے تقدیر کا عقیدہ لازم ہے۔ اب یہ کون کہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ذریعہ بیان کیا گیا تقدیر کا یہ ضمنی ثبوت بھی، ثبوتِ اصلی سے بڑھ کر واقع ہوا، کہ جو مسئلہ خطرہ کا تھا، دقیق تھا، بلا ضرورت خوض نہ پہلے صحیح تھا، نہ اب صحیح ہے؛ لیکن امام زمانہ نے جس تعبیر اور طریقہ استدلال کو اختیار کیا، اُس سے یہ پتہ بھی نہ لگنے دیا کہ مشکل مقام اور دلائل کب آنے والے ہیں، پہلے سے نام بھی نہ بتایا؛ گویا باغ میں پہنچا کر دکھا دیا کہ دیکھو یہ باغ ہے، یہ تو ہمارا اثر ہے، باقی امام فن کے اصل الفاظ میں چاشنی کیسی کچھ ہوگی، اُسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

”ان نقوش کے منجملہ موجودات کے ہونے کا انکار نہیں، ساری نشانیاں وجود کی موجود

ہیں۔ اور یوں بھی نہیں کہا جاتا کہ نقشوں کے لیے بھی نقشے اور وجود جدا ہیں، نہیں تو ایک سلسلہ لا انتہا نکل آئے گا، سوا سے کسی کی عقل قبول نہیں کرتی، پر اگر یوں کہا جائے کہ جیسے آفتاب کے ساتھ شعاعیں لگی ہوئی ہیں اور شعاعیں آفتاب ہی کے سبب روشن ہیں، پر ان کی روشنی ایسی عارضی نہیں جیسے زمین، آسمان، درودیوار کی روشنی، کہ اصل میں وہ تیرہ اور سیاہ ہیں، پر آفتاب کا نور ان کے اندھیرے کو مٹاتا ہے؛ بلکہ وہ (شعاعیں۔ ف) بھی مثل آفتاب ہی کے اصل سے منور ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ آفتاب کو نہیں پہنچتیں؛ کیوں کہ اول تو وہ آفتاب سے پیدا ہوئیں، دوسرے وہ بات کہاں، جو کہ آفتاب میں ہے؟ ایسے ہی تمام عالم کا نقشہ بھی خدا کے سبب قدیم سے ایک پنہا وجود رکھتا ہو، اور وجود اصلی ہو، مثل اس ظاہری وجود کے عارضی نہ ہو؛ ویسا اصلی بھی نہ ہو جیسا خداوند کریم کا وجود۔ اور اس نقشہ ہی کے مطابق اس وجود ظاہری کا کارخانہ برقرار ہوتا ہو؛ اور اس وجود پنہانی ہی کو وجود کہتے ہوں؛ اور اس وجود ظاہری کو اس وجود پنہانی سے ایسی نسبت ہو، جیسے کنویں کے عکس کو یا مہر کے حروف کو ہمارے ساتھ اور نگین کے نقوش کے ساتھ۔ یعنی جیسے کوئیں کے کنارے کھڑے ہوں، تو گو بیعینہ ہماری صورت نظر آئے گی، پر کچھ کچھ مخالفت ضرور ہوتی ہے۔ سر یہاں اوپر ہے اور پاؤں نیچے، تو وہاں برعکس ہے، ایسے ہی مہر کے حروف میں اور نگین کے نقوش میں الٹے سیدھے ہونے کا فرق ہے۔“ (۳۵) اور اس وجود پنہانی کے ماننے میں ایک یہ بھی بڑا فائدہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا تفصیل وار اس عالم کا قدیم سے جاننا ثابت ہو جائے گا۔ اگرچہ بالا جمال جاننے میں وہ اس وجود پنہانی میں محتاج نہیں؛ بلکہ سب کو بغیر اس کے بھی بالا جمال جانتا ہے۔ پر اس کے بالا جمال جاننے کے یہ معنی نہیں کہ کچھ جانا، کچھ نہ جانا؛ یہ تو جہل ہے اور عیب ہے۔ اور عیب کا اس کی ذات و صفات میں پتہ بھی نہیں؛ بلکہ اس کا بالا جمال جاننا تفصیل وار جاننے سے بھی زیادہ ہو، تو کچھ عجیب نہیں۔ جیسے آفتاب کی شعاعیں اور دھوپیں، اس کے نور کی تفصیل ہے، پر آفتاب کے جرم میں جو نور بھرا ہوا ہے، تو یہ بہ نسبت شعاعوں اور دھوپوں کے اجمالی معلوم ہوتا ہے؛ لیکن لاکھوں درجہ ان سے زیادہ معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ اسی سے پیدا ہوئی ہیں، اور اس کو لازم ہیں۔ ایسے اُس کے علم اجمالی سے تفصیلی پیدا ہوتا ہے۔ سو ہم اُس علم تفصیلی ہی کی معلومات کو موجودات پنہانی کہیں، تو کچھ مشکل نہیں۔ سو ہمیں اُس (علم تفصیلی) کے قدیمی ہونے میں کچھ انکار نہیں۔ (۳۶) بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ تقدیر کا ہونا لازم آئے گا، سو اس میں کیا خرابی ہے۔“ (۳۷) اور اسی کے ساتھ ایک مفید بات اور معلوم ہوگئی جو قرآن کریم کی اس آیت ”اِذَا ارَادَ اللّٰهُ

شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ“ (جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کے موجود کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو فرماتے ہیں کہ ہو جا، تو ہو جاتی ہے) سے متعلق ہے؛ کیوں کہ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ شئی تو حادث ہے، جب وہ ابھی موجود نہیں تو خطاب کس کو ہے؟ اس کا جواب مولانا تھانویؒ نے یہ دیا ہے کہ موجود فی العلم کو خطاب ہے کہ موجود فی الخارج ہو جائے۔ (۳۸) اس جواب کے ساتھ مولانا نانوتویؒ کی مذکورہ تشریح سے حاصل ہونے والا نتیجہ بھی شامل کر لیا جائے کہ قادرِ مطلق کے علم تفصیلی کی معلومات جو موجوداتِ پنہانی ہیں، اُن میں سے ہی ایک کو خطاب ہے کہ موجود فی العلم کے بعد اب موجود فی الخارج بھی ہو جائے، تو بات اور زیادہ صاف ہو جائے۔

اس کے علاوہ اس توجیہ و تشریح سے ایک اور مسئلہ بھی بے غبار ہو گیا، جس میں یہ اشکال پیدا ہوا تھا کہ ارادہ واجب یعنی خدائے تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد (یعنی جسے پیدا کرنا چاہا، وہ ف) حادث ہو۔ اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔ ایسی صورت میں اگر مولانا نانوتویؒ کی مذکورہ تشریح کی روشنی میں اس مسئلہ کو دیکھیں کہ جب موجوداتِ پنہانی یعنی علم تفصیلی کی معلومات نقشہ کی تمثیل میں موجود ہیں یعنی ”تمام عالم کا نقشہ خدا کے سبب قدیم سے ایک پنہاں وجود رکھتا ہو اور یہ وجود اصلی ہو؛ لیکن ویسا اصلی بھی نہ ہو جیسا خداوند کریم کا وجود“ تو اس وضاحت کے بعد استحالہ کا شبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ استحالہ لازم آنے کا شبہ تو اسی لیے ہوا تھا کہ وجود ذات سے علیحدہ تھا؛ البتہ اس جواب کی نزاکت کو سنبھالنا مولانا نانوتویؒ ہی کے علم کا حصہ ہے۔ متوسط عقول کے لیے مولانا تھانویؒ کا اور تمام متکلمین اہل حق کا صاف اور بے غبار جواب ہی کافی ہے کہ ”صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں؛ مگر ان کا تعلق ممکنات کے ساتھ حادث ہے اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے، اس سے پہلے نہیں۔“ (۳۹)

لیکن اس مسئلہ میں حکماء، متکلمین اور صوفیاء کے ہاں جس قسم کے محاورے اور اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں اور قرآن کریم نے علم و قدرت وغیرہ صفاتِ باری تعالیٰ کو جس معنی میں استعمال کیا ہے، وہ ذرا وضاحت طلب ہے؛ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی صراحت کے مطابق:

”صوفیاء کی اصطلاح کچھ تو خاص ہیں اور کچھ دوسری اصطلاحات و اطلاقات ہیں حتیٰ کہ کچھ عوام کے محاورات سے لی ہوئی ہیں؛ مثلاً یہ کہ مخلوق کو عین حق کہتے ہیں، یہ خاص اصطلاح پر ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ تعلق خاص احتیاج و تابلیغ کا ہے؛ بس یہی مراد ہے صوفیاء کے اس قول کی

(مخلوق عین حق ہے)۔ اور صوفیاء کے اس قول کی اس توجیہ پر ایک قرینہ موجود ہے؛ کیوں کہ واجب کو خلق سے مبائن بھی کہتے ہیں، تو عین سے مراد معنی متعارف نہ ہوں گے۔ اور اسی طرح متکلمین بھی دوسرے محاورات کا استعمال کرنے لگتے ہیں، مثلاً صفات واجب کو لایعین ولا غیر کہتے ہیں۔ یہاں غیر کے معنی بے تعلق اور منفصل کے ہیں، جیسا کہ آفتاب کی شعاع آفتاب کا غیر نہیں، یعنی منفصل اور بے تعلق نہیں۔ اور حکماء صفات واجب کو عین، اصطلاح معقولین (کے اعتبار سے) کہتے ہیں۔ متکلمین نے اس لیے ان کا رد کیا کہ یہ درحقیقت صفات کی نفی ہے۔ اور قرآن کریم سے حسب معنی لغوی کہ وہ حقیقی معنی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ اس کی ذات پر زائد ہیں، جیسے علیم و قدیر بمعنی موصوف بالعلم والقدرة، نہ کہ خود علم و قدرت۔ اور متکلمین پر حکماء کی طرف سے ایک سخت اعتراض بھی ہے اور یہ اعتراض یہ ہے کہ صفات حق جب عین نہیں ہیں تو مغائر ہوں گی، پس واجب اپنے کمال میں غیر کا محتاج ہوا؟ اس کا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پٹیؒ نے بہت عمدہ دیا ہے کہ احتیاج واجب کی ہر مغائر کی طرف ممنوع نہیں ہے؛ بلکہ مغائر منفصل کی طرف ممنوع ہے اور صفات باری مغائر تو ضرور ہیں؛ مگر مغائر منفصل نہیں؛ بلکہ متصل ہیں۔ (۴۰) اور آخری بات وہی ہے کہ ”مسئلہ دقیق ہے، بلا ضرورت اس میں خوض کرنا بھی جائز نہیں۔“

مذکورہ بالا تمام گفتگو سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی کہ علت و معلول، واحد و کثیر اور موجود و معدوم کی ابحاث جو فلسفہ قدیمہ میں موجود ہیں، نیز درسیات میں ان کی تعلیم متداول چلی آرہی تھی اور ان ابحاث پر مشتمل کتابیں پڑھنے پڑھانے میں آتی رہی تھیں، کتنی ضروری تھیں اور اب بھی ہیں! ایسی حالت میں انھیں موقوف کر دینا، کس قدر نقصان دہ ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ بحثیں جس فن سے متعلق ہیں، وہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے جس کا اصطلاحی نام ”امور عامہ“ ہے۔

مسائل کلامیہ سے متعلق مصنفات امام قاسم نانوتویؒ سے استفادہ کی خواہش رکھنے والا اسکالر اُسی وقت اپنے لیے ایک رکاوٹ اور پیریز پیدا کر لیتا ہے جب وہ امور عامہ پڑھے بغیر مطالعہ کی حرص کرتا ہے۔ امور عامہ وہ فن ہے جس میں اُن چیزوں سے بحث کی جاتی ہے جو مجردات و مادیات دونوں میں مشترک ہیں؛ لیکن اس کی دوسری قسم جس میں خدائے برتر کی ذات و صفات اور جواہر مجردہ کے اوصاف سے بحث کی جاتی ہے اور اُس کا اصطلاحی نام ”علم الہی“ (یا الہیات) ہے، اگر درسیات پڑھنے کے زمانہ میں مابعد الطبیعیات کے اس فن کی کچھ

اصطلاحات کانوں میں پڑ چکی ہیں، تو دلائل کے افہام و تفہیم میں ایک رکاوٹ ہی رہتی ہے۔ پھر استفادہ کی خواہش رکھنے والے اسکالر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مولانا نانوتویؒ کی تصانیف، خصوصیت کے ساتھ بوادر النواذر وغیرہ (۴۱) میں جو بحثیں ہیں ان کو بھی ملاحظہ میں رکھے؛ کیوں کہ اگر ان پر نظر نہیں ہے، تو موضوع اور مسئلے کو سمجھنا نہ صرف سخت دشوار ہے؛ بلکہ ایسی صورت میں مصنفاتِ امام نانوتوی کے اوراق، مطالعے کی غرض سے کھولنا ہی، شاید ایک زائد کام محسوس ہو۔ حضرت امام کی تمام کتابوں کے مضامین (حجۃ الاسلام کا استثناء ممکن ہو) اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ مثال کے طور پر وجود عدم، موجودِ اصلی، موجودِ عارضی کے متعلق وضاحت و طمانینت حاصل کرنے اور متعلقہ مسئلے سے پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ کرنے اور اس بحث کو قابو میں لانے کے لیے، جو کہ تقریرِ دل پذیر کے صفحہ ۴۱ سے ۱۷۲ تک چلی گئی ہے، ملاحظہ کر لینا بھی اس ضرورت کے احساس کے لیے کافی ہے۔ پھر علومِ عقلیہ کے مبادی، مسائل سے واقفیت کے ساتھ مہمبذی میں مذکور بحث ”فی اثبات الواجب لذاتہ“، ”واجب الوجود و مراتب الوجود“ کی ان بحثوں کو نہ صرف ملاحظہ فرمانا؛ بلکہ ان سے مناسبت ہونا بھی ضروری ہے جو مختلف فصلوں کے تحت مہمبذی کے صفحہ ۴۵ سے ۱۶۱ تک چلی گئی ہے؛ نیز صفحہ ۱۶۱ و مابعد کے صفحات میں عقولِ مجردہ کی بحث بھی متوازی مطالعے کی حیثیت سے مفید و مددگار ہیں۔ اگر ان سب پر نظر رہے، تو اس وقت حضرت نانوتویؒ کی مذکورہ تشریحات اور ذکر کردہ مسائل کی اہمیت اور صحیح قدر معلوم ہو، اور دلائل کی کیفیت اور وزن کا بھی ہو۔

عقائدِ اسلامی کی غیروں کے حملے سے حفاظت و مدافعت کے حوالے سے امام قاسم نانوتویؒ کی کلامی تصنیفات میں یہی ٹھوس اور ناقابل ردِ عقلی و مشاہداتی دلائل ہیں جن کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی گئی؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ کے کسی بھی مضمون کو پڑھنے کے بعد بالفاظِ مولانا عتیق الرحمن عثمانی ”کوئی سلیم الطبع اور متلاشی حق انسان اسلام کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کرنے سے ابا نہیں کر سکتا۔“ کیوں کہ ان دلائل میں طریقہ استدلال اور اسلوب بیان تصوراتی و خیالی طرز پر نہیں ہے؛ بلکہ خارجی تشکیلاتی حوادث پر محسوساتی و مشاہداتی اصولِ موضوعہ کے حوالے سے عقلی، کلامی اور شرعی حقائق کا انطباق دکھانا اور اس کے لیے دلائل میں مقدمات کی ترتیب ایسی مقرر کرنا جو بالکل عقلی اور طبعی ہوں، یہ پیش نظر ہے؛ تاکہ ”اصولِ اسلام اور فروغِ ضروریہ حسب قواعدِ عقلیہ منضبط ہو جائیں جس کی تسلیم میں کسی عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو۔“

حواشی:

(۱) مجالس الحکمت مرتبہ حکیم محمد مصطفیٰ بجنوریؒ میں مذکور ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا ”تجدیر الاناس“ میں کئی مقامات پر مولانا (محمد قاسم نانوتویؒ) نے انبیاء کے اقصاف بالکمالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ فی العروض کہا ہے، تو یہ مولانا کی اصطلاح ہے، اس سے مراد واسطہ فی الثبوت ہے؛ کیوں کہ واسطہ فی العروض کے معنی تو یہ ہیں کہ ذی واسطہ حقیقۃً موصوف ہی نہ ہو؛ بلکہ موصوف، محض واسطہ ہی ہو، جیسے سفینہ و جالس سفینہ کہ متحرک، محض واسطہ یعنی سفینہ ہی ہے اور ذی واسطہ یعنی جالس حقیقۃً متصف بالحرکت ہی نہیں، تو کمالات انبیاء میں بھی واسطہ فی العروض کے معنی یہ ہوں گے کہ ”مَا كَانُوا مُتَصِفِينَ بِالْثُبُوتِ وَكَمَالَاتِهَا حَقِيقَةً“، حالاں کہ خود حق تعالیٰ نے جا بجا قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے: لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَمِثْلَهُ اور اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا وغیر ذالک۔ پس واسطہ فی الثبوت مراد ہے، جیسے حرکت بد، مفتاح کے لیے کہ واسطہ اور ذی واسطہ دونوں، بالذات متحرک ہے، محض تقدم ذاتی کا فرق ہے۔..... اور اسی واسطہ یعنی فی العروض کے اس معنی کے اعتبار سے کہ ”ذی واسطہ حقیقۃً موصوف ہی نہ ہو“ علامہ برنجی مدنی نے واسطہ فی العروض ہونے پر انکار کیا ہے اور اس پر مولوی ظفر احمد صاحبؒ نے کہا کہ مولانا خلیل احمد صاحب سلمہ سہانپوری نے فرمایا تھا کہ اس کا خلیجان میرے دل میں بھی ہوا کرتا تھا، اس کی تاویل کرنا ہوگی، باقی اصطلاح کا علیحدہ ہونا، یہ امر کا برآء عن کا پر موروث ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی بھی خاص اصطلاحات ہیں۔..... اس کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ اس واسطہ فی العروض کی مولانا (نانوتویؒ) نے یہ امثلہ لکھی ہیں، جیسے دیوار کا منور ہونا آفتاب سے، یا پانی کا آگ سے گرم ہونا، فرمایا اس سے تاویل کی تصریح تا سید ہوگی؛ کیوں کہ یہ اشارہ فی الحقیقت بھی موصوف ہوتی ہیں، اب صاف معلوم ہو گیا کہ واسطہ العروض سے واسطہ فی الثبوت ہی ہے، پھر فرمایا کہ مولانا کے علوم کنفی تھے، ان کو واقف ہی سمجھ سکتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: ۲۹، مجالس حکمت: ۲۰۵، ۲۰۶)..... یہی حقیقت ہے کہ مولانا نانوتویؒ کی اصطلاح کو واقف ہی سمجھ سکتا ہے، جسے ایک طرف علوم مکافہ میں بھی کچھ درک ہو، دوسری طرف مولانا نانوتویؒ کی ذات سے بھی جو کہ اب واسطہ درواسطہ ہی ممکن ہے، مناسبت حاصل ہوگی ہو، مولانا تھانویؒ کی مذکورہ بالا توجیہ بالکل حق اور درست ہے اور اسی توجیہ کے ذریعہ کتنے ہی مقامات سے خلیجان دور ہو جاتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی بعض مقامات پر مولانا نانوتویؒ نے ”عرض“ کے ایک دوسرے معنی بھی بتلائے ہیں، یعنی واسطہ فی العروض سے مراد واسطہ فی الثبوت ہونے کی نفی فرمائی ہے؛ چنانچہ آب حیات: ص ۶۸ پر ارشاد ہے ”مگر یہ بات یاد رہے کہ وجود کا عارض ہونا بمعنی بالعرض جو مقابل بالذات ہوتا ہے، بمعنی عرض مقابل جو ہر نہیں، جو یوں کہا جائے کہ وجود جو اپنے تحقق میں سب سے مستغنی ہے اور سب اپنے تحقق میں اس کے محتاج۔“..... مولانا نانوتویؒ یہ فرما رہے ہیں کہ بالعرض جو ہر بھی ہو سکتا ہے، جو ہر پر عرض کا اطلاق محال نہیں ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ فی العروض ہونے کے باوجود انبیاء کا استقلالی اور جوہری وجود برقرار رہتا ہے؛ اس لیے ”اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا“ وغیرہ کے معارض نہیں۔ جب معارض نہیں تو یہ اشکال بھی وارڈ نہیں ہوتا کہ انبیاء کا وجود اگر عرض ہوگا تو پھر جوہر کون ہوگا؟ ”ہاں بالعرض کا اطلاق جو ہر پر محال ہوتا تو میرا کہنا بھی بیجا تھا۔“ (دیکھیے آب حیات: ۶۸، ۶۹، نیز ص ۳۶، شیخ الہند اکیڈمی ۱۴۲۹ھ)

(۲) بطور نمونہ کے ملاحظہ ہو ”قبلہ نما“ میں لکڑی کے خشک ستون کا گریہ، بنگریزوں کی تسبیح اور شفق القمر کی بحث، ”حجۃ الاسلام“ میں اعجاز عملی پر مفصل گفتگو اور تقریر دل پذیریں صفحہ ۹۵ تا ۱۱۵ قانون کش وغیرہ پر کی گئی تنقیدات۔

(۳) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (ولادت ۱۳ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۲ جولائی ۱۸۳۳ء، وفات یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۸۸ء) دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی بنیادی معاون، سرگرم سرپرست اور صدر مدرس تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کئی کے دست مبارک پر بیعت ہوئے، خلافت و اجازت سے نوازے گئے، حضرت حاجی صاحبؒ کی کتاب ضیاء العلوم کا

عربی میں ترجمہ کیا، مولانا یعقوب صاحب ہندوستان کے نامور علماء اہل درس و معرفت اور متاثر ترین اصحاب کمال میں سے تھے اور مولانا تھانویؒ کی خاص استاذ مرنے لے، حضرت مولانا تھانویؒ نے فتویٰ نویسی کی مشق حضرت مولانا یعقوب صاحب کی ہی خدمت میں رہ کر کی۔ (دیکھیے قاسم العلوم احوال و آثار از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، حاشیہ: ص ۱۶۷)۔

(۴) سوانح قاسمی از مولانا مناظر حسن گیلانی: ۳۵۰۔

(۵) ملفوظات حکیم الامت: ۲، الافاضات الیومیہ: ۳۶۴/۲۔

(۶) وہ تین ممتاز شاگرد یہ ہیں: حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حضرت مولانا فخر الحسن لنگوہی، حضرت مولانا احمد حسن امروہیؒ۔

(۷) سوانح قاسمی از مولانا، مناظر حسن گیلانی: ۳۲۸/۲۔

(۸) فاتحہ واجب ہے؟ ص ۵۵۔

(۹) یہ بات ایسی ہے جسے ”شیخ علی نے ۲۵ دفعہ اول سے آخر تک احیاء العلوم کو پڑھا۔“

(۱۰) فاتحہ واجب ہے؟ ص ۳۱، ۳۲۔

(۱۱) حکمت قاسمیہ: ص ۲۲، ۲۰، فاتحہ واجب ہے؟ ص ۳۱، ۳۲۔

(۱۲) انفعہم تصنیفاً..... الخواص مولانا الحاج محمد قاسم النانوتوی آیتہ کبریٰ من آیات اللہ تعالیٰ: خواص کے لیے سب سے زیادہ نافع مولانا الحاج محمد قاسم النانوتویؒ کی تصانیف ہیں، اللہ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ (مآدروس از مولانا تھانویؒ اور ترجمہ مفتی محمد شفیع صاحب)

(۱۳) سوانح قاسمی: ۳۹۹۲۔

(۱۴) ایضاً: ص ۳۹۹۔

(۱۵) قاسم العلوم احوال و آثار: ص ۶۶۔

(۱۶) مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں ”انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں۔ عقل ایک قوت ہے جو خدائے تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کی ہے، جس سے کلیات کا ادراک کرتا ہے، پس علماء محققین خواہ تجربہ کار نہ ہوں؛ مگر کامل العقل ہوتے ہیں اور یہی ورثہ الانبیاء ہیں۔“ (ملفوظات: ۳۸/۳۹۱، ۳۹۲)

(۱۷) تقریر دل پذیر: ۲۲ تا ۲۴، شیخ الہند اکیڈمی۔

(۱۸) ملاحظہ فرمائیے تقریر دل پذیر: ص ۱۴۔

(۱۹) دیکھیے تقریر دل پذیر ص ۱۳ تا ۳۹۔

(۲۰) دیکھیے تقریر دل پذیر ص ۸ تا ۷۹۔

(۲۱) تقریر دل پذیر: ص ۵۰۔

(۲۲) حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب مدظلہ الامین عام جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، اس موقع پر ہماری طرف سے بہت زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں، جنہوں نے مظاہر علوم میں بیان کیے گئے حکیم الامت کے مواعظ جمع کر دیے، جس کی وجہ سے بطور خاص طلباء و علماء کے ذوق و ضرورت کا بے شمار تحقیقی مواد یکجا مل جاتا ہے۔..... یہیں پر یہ مشورہ بھی دینے کا جی چاہتا ہے کہ حضرت کے مواعظ کا ایک اہم بلکہ اہم ترین حصہ وہ بیانات بھی ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں ہوئے، ارباب دارالعلوم دیوبند کی توجہ سے اگر وہ مواعظ بھی یکجا ہو کر مجموعہ کی شکل میں مستطاف چھپ جائیں، تو کیا ہی عمدہ بات ہو!

(۲۳) مظاہر الآمال و عوץ نمبر ۵، ص ۲۵۴، نیز دیکھیے اشرف التفاسیر: ج ۲/ ص ۳۶۳، ۳۶۴۔

(۲۴) اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے؛ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کلیہ کی فروعات اور مندرجہ امثلہ کی تشفیقات و تجزیاتی تحقیقات سے

جن بے شمار مسئلوں کا حل دریافت ہو جاتا ہے، ان کا کوئی حد و حساب نہیں۔

(۲۵) ان میں سے کئی مسئلوں کو خود مولانا نانوتویؒ نے بیان بھی کیا ہے، ملاحظہ ہو تقریر دل پذیر: ص ۴۷ تا ۱۷۲۔ اور تقریر دل پذیر کے علاوہ دوسری تصنیفات میں بھی مضمون کی مناسبت سے حرب موقع متعدد مسئلے موجود ہیں۔

(۲۶) تقریر دل پذیر: ص ۵۲۔

(۲۷) براہین قاسمیه: ص ۲۷، مکتبہ دارالعلوم ۱۳۳۳-۱۴۱۲ھ۔

(۲۸) حضرت مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے جو حضرت مولانا نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، انہوں نے ہی حضرت نانوتویؒ کے مضامین دلائل اور براہین کو ترتیب دیا تھا۔ اس کے متعلق مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ براہین قاسمیه کے ”دلائل و تقریرات سب کی سب حضرت شمس الاسلام نانوتویؒ رحمہ اللہ علیہ کے زوق قلم کا نتیجہ ہیں اور چونکہ دلائل کے مقدمات دیگر کتب سے ماخوذ نہیں ہوتے؛ بلکہ وہ خود ممدوح کی طبع رسا کا نتیجہ ہوتے ہیں، جن کی تقریر کے ضمن میں ایسے فوائد علمی بھرے ہوئے ہوتے ہیں، جن میں بہت سے مشکل مضامین کا حل بھی مضمر ہوتا ہے؛ اس لیے ان کی افادیت صرف اتنی ہی نہیں ہوتی کہ وہ کسی معترض کا منہ بند کرنے تک محدود ہو؛ بلکہ وہ پائیدار اصولوں کی حیثیت سے غور و فکر کی صحیح راہیں ایک متعلم و شائق علم کے سامنے کرنے والے پائیدار فوائد کے حامل ہوتے ہیں۔“

(۲۹) واجب الوجود کے مضمون کا بھی یہی حاصل ہے کہ اُس کی ذات خود اس کے وجود کی علت ہو۔ اور یہیں سے ایک اہم گتھی مولانا نانوتویؒ نے کھول دی ہے، یعنی جو لوگ خدا کے قائل ہونے کے ساتھ مادہ کو بھی قدیم سمجھتے ہیں، ایسے لوگوں کے مقابلے میں مولانا نانوتویؒ نے ہر م مادہ کی دلیل کے ”ظلم کو توڑ کر رکھ دیا ہے، فرماتے ہیں کہ ”حقیقت میں اگر غور صحیح کیا جاوے، مقدم مادہ کے ہوتے ہوئے، پھر خود صانع ہی کی ضرورت نہیں رہتی؛ کیوں کہ جب اس کی ذات، اس کے وجود کی علت ہے تو وہ واجب الوجود ہو گیا اور ایک واجب الوجود کا دوسرے واجب الوجود کی طرف محتاج ہونا خود خلاف عقل ہے، جو تعلق حق تعالیٰ کا اپنی صفات و افعال سے ہے، وہی تعلق اس (مادہ) کا اپنی صفات حرکت و حرارت اور اپنے افعال و تنوعات وغیرہ سے ہو سکتا ہے۔ پس خدائے برحق کا قائل ہونا خود موقوف ہے حدوثِ مادہ پر“ اسی لیے ”اہل سائنس خود خدا ہی کے قائل نہیں۔“ (الانتہات المفید: ص ۳۰، مطبع انتظام کراچی ۱۳۳۳ھ)

(۳۰) لالہ آندل لال نے رسالہ ”آریہ سماچار“ میرٹھ میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، اور اندازِ نگارش بھی نہایت سو قیانہ بلکہ گستاخانہ تھا۔ براہین قاسمیه سی گستاخانہ تحریر کے جواب میں ۱۲۹۶ھ میں لکھی گئی تھی۔

(۳۱) براہین قاسمیه: ص ۲۹: ۳۱۔

(۳۲) خطبات و مواہظ حکیم الامت: ۵، مظاہر الآمال: ص ۲۵۴۔

(۳۳) خطبات و مواہظ حکیم الامت: ۵، مظاہر الآمال: ص ۲۵۴، مرتب مولانا ظفر احمد عثمانی۔

(۳۴) ”ذات اسے ہی کہتے ہیں جس سے تمیز حاصل ہو۔“

(۳۵) تقریر دل پذیر: ص ۶۶ تا ۶۸۔

(۳۶) یہ قدیم کا لفظ صرف اعتباری ہے، یعنی دوسرے حوادث کے مقابلے میں پہلے پیدا کیا گیا، نہ کہ وہ قدیم جو فلاسفہ مشائخین کی اصطلاح میں مستعمل ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بیان کردہ اس مسئلہ کو گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور طبیب و فلسفی ابوالحسن احمد بن محمد طبری نے اپنے الفاظ میں زیادہ صاف طریقے سے بیان کر دیا ہے، وہ لکھتا ہے: ”یہوئی تمام متضادات کے لیے مساوی طور پر بنایا گیا ہے۔ عنصر مٹی سے بنی ہوئی چیز کی طینت اور اصل ہے، صورتیں اللہ کے یہاں محفوظ ہیں۔ انہی محفوظ صورتوں سے صورتیں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ اگر سوال کیا جائے کہ یہ صورتیں اللہ کے ساتھ قدیم ہیں یا قدیم نہیں ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے سوا ہے وہ تو پیدا اور حادث ہے، گویا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عقل، نفس، عنصر، صورت کو اکب، افلاک

اور امہات (اصل عناصر) کو پیدا فرمایا۔ پھر اُن کی آمیزش کی اور اُن سے حیوانات اور نباتات بنائے، پس اس جواب پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا۔“ (المعالجات البقراطية، مقالہ اول، باب ۳۲: ”عدم مطلق و عدم مفید: ص ۹۶، اردو ترجمہ سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، سن اشاعت ۱۹۹۵ء)۔

(۳۷) تقریریں پذیر: ص ۶۹، ۷۰، اشرف التفسیر: ج ۲/ص ۳۶۳۔

(۳۸) وَ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ. (خدائے تعالیٰ کی قدرت ایسی عظیم اور عجیب ہے کہ جب کسی کام کا پورا کرنا چاہتے ہیں تو (پس اتنی بات ہے کہ) اُس کو (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں فائدے کے تحت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ”اِس کُن کہنے میں دو احتمال ہیں: ۱۔ ایک یہ کہ مجاز ہو، سرعتِ تکوین اور جلدی بنا دینے سے ۲۔ دوسرے یہ کہ حقیقتاً حق تعالیٰ کی یہی عادت ہو۔

اس پر دو شبہ کیے گئے ہیں: ۱۔ ایک یہ کہ جب وہ شئی موجود نہیں تو کُن کس کو کہا؟ جواب یہ ہے کہ علم میں موجود ہے۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ خود کُن بھی حادث ہے، ورنہ (اگر کُن حادث نہ ہو بلکہ قدیم ہو تو ف) قدم، مکُون کا لازم آوے گا۔ اور (یہ محال ہے، اس لیے جب کُن حادث ہو تو ف) اس کے لیے اگر کُن ہو تو تسلسل لازم ہے۔ جواب یہ ہے کہ صرف لفظ کُن کو بدون کُن پیدا کر دیا ہو۔ اور اگر قدیم بھی مان لیا جاوے تب بھی تعلق کے حدود سے مکُون محدث رہے گا۔ رہا خود اس تعلق حادث کے ایجاد کے لیے ایک دوسرے تعلق حادث ہونا: اس لیے ضرور نہیں کہ تعلق لاموجود و لامعوم ہے، لہذا نہ ایجاد کی ضرورت ہے اور نہ علت ایجاد بننے میں کوئی اشکال۔ رہا کلام اس تعلق کے مرجع میں سو وہ ذات حق ہے، اور بوجہ وجود و صفیٰ ارادہ کے جس کی ذاتیات یا لوازم سے ترجیح و تخصیص، متی شاد ہے، یہ تخصیص و ترجیح بلامرجح و تخصیص بھی نہیں بلکہ وجہ ترجیح کا سوال کرنا تخلیلِ جعل بین الذات والدائی یا بین الملزوم والملازم کا تجویز کرنا ہے، وہ بواطل۔“ اس کے بعد مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: ”حضرات ناظرین اس مقام پر مجھ کو اس خاص طرز پر طالب علمانہ تحریر میں بوجہ ضرورتِ تشہیم فلسفی مزاج صاحبوں کے معذور فرمادیں۔“ (بیان القرآن: ج ۱/ص ۶۴، تاج پبلشرز دہلی)

(۳۹) اشرف الجواب: ص ۵۶۸۔

(۴۰) ملفوظات: ج ۲، ۶، الکلام الحسن: ۱۴۶، ۱۴۷، ادارۃ تالیفات اشرفیہ، ایڈیشن ۱۴۲۵ھ

(۴۱) مثلاً الطائف من الطائف یعنی لطائف ستہ، ظہور العدم بنور القدم، تمہید الفرش فی تحدید العرش۔



صحابِ ستہ

تعارف و خصوصیات

(قسط سوم)

از: مولانا اشرف عباس قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

صحابِ ستہ کے تراجم

تراجم، ترجمہ کی جمع ہے، جس کا معنی ہے: مراد واضح کرنا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا۔ کتبِ حدیث میں ترجمہ بولا جائے تو اس سے ”عنوان“ مراد ہوتا ہے۔ اس کو ترجمہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے مابعد آنے والے مضامین کی وضاحت کرتا ہے۔

علماء نے تراجم کے اعتبار سے بھی صحاحِ ستہ میں درجات قائم کیے ہیں کہ کس کتاب کے تراجم سب سے زیادہ دقیق و مشکل اور کس کے آسان ہیں؛ چنانچہ سب سے دقیق تراجم امام بخاریؒ کے قائم کردہ ہیں۔ دوسرے نمبر پر سنن نسائی، تیسرے نمبر پر سنن ابی داؤد اور چوتھے نمبر پر سنن ابن ماجہ کے تراجم ہیں، اور اخیر میں جامع ترمذی کے تراجم ہیں، اسی وجہ سے ترمذی کے تراجم کو اسہل التراجم کہا گیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

”البخاری هو سباق الغایات فی وضع التراجم بحيث ربما تنقطع دون فهمها مطامع الأفكار، ثم يتلوه فی التراجم ابو عبد الرحمن النسائی، وربما أری فی مواضع أن تراجمها تتوافق كلمة كلمة، وأظن أن النسائی تلقاها من شیخه البخاری، حیث أن التوارد يستبعد فی مثال هذا، ولا سیما إذا كان البخاری من شیوخه، ثم يتلوه تراجم ابی داؤد، وتراجم ابی داؤد أعلیٰ من تراجم الترمذی، نعم إن أسهل التراجم وأقربها إلى الفهم تراجم الترمذی، وأما الإمام مسلم فلم يضع هو نفسه التراجم، والتراجم الموجودة فی کتابه من وضع شارحه الإمام النووی وکم بین تراجمه و بین تراجم البخاری من فرق بعيد“ (معارف السنن ۱/۲۳)

ترجمہ: امام بخاریؒ تراجم قائم کرنے میں اس طرح انتہا تک سبقت کرنے والے ہیں کہ بسا اوقات ان کے فہم تک افکار و خیالات کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ تراجم قائم کرنے میں بخاری کے بعد دوسرا درجہ ابو عبد الرحمن نسائی کا ہے۔ بہت سے مقامات پر میں دیکھتا ہوں کہ نسائی کے تراجم، حرفاً حرفاً بخاری کے تراجم کے موافق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے امام نسائی نے اپنے شیخ امام بخاری سے (براہ راست) اخذ کیا ہے؛ کیوں کہ اس طرح کی چیزوں میں توار و دلوب مستبعد ہے، خاص کر اس وقت جب کہ بخاری کا شیخ نسائی ہونا متحقق ہے۔ اس کے بعد ابوداؤد کے تراجم کا درجہ ہے۔ اور ابوداؤد کے تراجم کا مقام و مرتبہ ترمذی کے تراجم سے بڑھا ہوا ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ سب سے آسان اور جلد سمجھ میں آنے والے، ترمذی کے تراجم ہیں؛ جہاں تک تعلق ہے امام مسلم کا، تو انھوں نے تراجم خود قائم نہیں کیے ہیں۔ ان کی کتاب میں موجود تراجم، شارح مسلم، امام نوویؒ کے قائم کردہ ہیں اور نووی و بخاری کے تراجم میں بہت واضح فرق ہے۔

خلاصہ یہ کہ بخاری و نسائی کے تراجم سب سے زیادہ دقیق اور مشکل ہیں، ابوداؤد ابن ماجہ کے تراجم متوسط حیثیت کے حامل ہیں۔ اور ترمذی شریف اسہل التراجم ہے۔ رہی بات مسلم شریف کی تو اس میں خود مصنف نے تراجم قائم نہیں فرمائے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی کتاب کو حسن ترتیب کے ساتھ ابواب کا لحاظ کرتے ہوئے مرتب فرمایا ہے۔ ہمارے دیار میں مسلم شریف کا جو نسخہ رائج ہے، اس پر امام نوویؒ کے قائم کردہ تراجم ہیں؛ لیکن انھوں نے شافعی المسلک ہونے کی وجہ سے بہت سے مواقع پر مسلک کے موافق ترجمہ قائم کر دیا ہے؛ لہذا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے مسلم شریف کی مبسوط اور عالمانہ شرح فتح الملہم لکھنی شروع کی تو انھوں نے اپنی طرف سے تراجم قائم کرنے کا بھی اہتمام کیا۔

صحاح ستہ کے مجموعے

اصول ستہ کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر بعض مطابع نے ایک ساتھ چھ کی چھ کتابوں کے مجموعے شائع کرنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ اس وقت اس طرح کے دو مجموعے معروف و متداول ہیں:

۱۔ ”الکتب الستة“ کے نام سے دارالسلام ریاض نے ایک ہی جلد میں انتہائی اعلیٰ اور معیاری کاغذ پر اٹلی سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ مملکت سعودی عرب کے موجودہ وزیر شؤون اسلامیہ شیخ صالح بن عبد العزیز آل الشیخ کی زیر نگرانی اس مجموعے میں صحت اور ترتیم کا خاص خیال رکھا گیا

ہے۔ کلاں سائز کے ۲۷۵۴ صفحات میں مکمل چھ کی چھ کتابوں کو واضح خط کے ساتھ سمودیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی مدد سے بیک وقت صحاح ستہ سے استفادے میں کافی آسانی ہوگئی ہے۔

قابل ذکر ہے کہ چند ماہ قبل فروری ۲۰۱۲ء میں جب وزیر موصوف نے ایک بڑے وفد کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند کا دورہ کیا، تو اپنے اعزاز میں منعقد استقبالیہ تقریب میں انھوں نے بڑے اہتمام سے اپنی زیر نگرانی تیار کتب ستہ کا یہی مجموعہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کی خدمت عالی میں پیش کیا تھا۔

۲- ”الکتب الستة“ دو جلدوں میں یہ بھی صحاح ستہ کا قابل قدر مجموعہ ہے، جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۴۱۵۴ ہے۔ پہلی جلد میں کتب اربعہ ہیں جب کہ دوسری جلد میں نسائی، ابن ماجہ اور فہارس ہیں۔ خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شیخ رائد بن صبری بن ابی علقہ کے اعتناء سے مکتبہ الرشید نے اس کو شائع کیا ہے۔

صحاح ستہ کی علمی خدمت

صحاح ستہ کو امت میں جو وقار و اعتبار حاصل ہوا، اس کے سبب ہر زمانے میں اہل علم کی ایک جماعت نے مختلف پہلوؤں سے ان کی خدمت کی ہے۔ الگ الگ ان کتابوں کی خدمت کا اجمالی نقشہ آگے آئے گا۔ اس وقت ہم صرف ان چند مؤلفات کا تذکرہ کریں گے جو خصوصیت کے ساتھ کتب ستہ کے ارد گرد گھومتی ہیں اور ایسی کئی کتابیں ہیں، ہم سرِ دست صرف پانچ کا ان کی متنوع خصوصیات کے سبب تذکرہ کر رہے ہیں۔

۱- ”الکاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة“ یہ حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (م ۷۴۸ھ) کی مشہور تالیف ہے، جس میں انھوں نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ کتب ستہ کے رجال پر کلام کیا ہے۔ اس پر ابراہیم بن محمد سبط الجلی (م ۸۴۱ھ) کا محققانہ حاشیہ بھی ہے۔ شیخ محمد عوامہ اور احمد محمد نمر الخطیب کی تصحیح و مراجعت سے یہ کتاب مؤسسۃ علوم القرآن جدہ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲- ”الأُنوار اللمعة في الجمع بين مفردات الصحاح الستة“ یہ حافظ حدیث ابن الصلاح ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمن الموصلی الشہر زوری (م ۶۴۳ھ) کی مایہ ناز تصنیف ہے، جس میں انھوں نے کتب ستہ کے علاوہ سنن دارمی کی مفرد روایات کو جمع کر دیا ہے۔ مصنف نے

سب سے پہلے صرف صحیح مسلم کی احادیث کے متون کو اسانید و تکرار کے حذف کے ساتھ جمع کیا تھا۔ اس کے بعد ان روایات کو جمع کیا جن میں امام بخاریؒ امام مسلمؒ سے منفرد ہیں۔ اسی طرح باقی کتابوں کی صرف وہ روایات لی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ یہ عظیم مجموعہ سید کسروی حسن کی تحقیق سے مکتبہ عباس احمد الباز مکتبہ المکرمۃ نے چار جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔

۳- ”الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ“ اس کتاب میں نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) نے کتب ستہ کے انفرادی تعارف اور خصوصیات کو جمع کر دیا ہے۔ مقصد کے آغاز سے قبل تمہیدی طور پر علم حدیث کی بعض عمومی بحثیں بھی ہیں؛ البتہ کئی مقامات پر مصنف کا قلم لغزش کھا گیا ہے؛ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے اس کتاب میں در آنے والے اوہام پر کلام کیا ہے۔ علامہ کتائی فرماتے ہیں: ”إن فی الحطۃ أوہاماً“ (فہرس الفہار ۱/۳۶۳) علی حسن المحلی کی تحقیق و تعلیق سے کتاب کا نیا ایڈیشن بیروت اور عمان سے شائع ہو چکا ہے۔

۴- ”فی رحاب السنۃ الکتاب الصحاح الستۃ“ یہ فضیلۃ الشیخ محمد محمد ابو شہنہ کی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے کتب ستہ میں سے ہر ایک کا الگ الگ مفصل تعارف اور اس کی خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ شروع میں سنت کی قدر و منزلت کے حوالے سے فاضلانہ مقدمہ بھی ہے ۱۸۷ صفحات پر مشتمل یہ اہم کتاب جامع ازہر کے مجمع الجوٹ الاسلامیہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔

۵- ”موسوعة رجال الكتب التسعة“ یہ دکتور عبدالغفار سلیمان البنداری اور سید کسروی حسن کی مشترکہ تصنیف ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس میں کتب تسعہ کے رجال کا استقصاء کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ مسند ابی حنیفہ اور مسند الشافعی کے رجال کو بھی جمع کر دیا گیا ہے۔ دارالکتب العلمیہ بیروت نے یہ موسوعہ شائع کیا ہے۔

صحاح ستہ کے اطراف

محدثین کی زبان میں مسانید اور اطراف دونوں میں مرکزی توجہ روایت کنندہ صحابی پر ہوتی ہے یعنی ہر صحابی کی مرویات کو بلا لحاظ مضمون یکجا کیا جاتا ہے؛ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسانید میں پوری حدیث بیان کرتے ہیں؛ مگر اطراف میں صرف حدیث کا کوئی مشہور حصہ بیان کر کے شیخین اور سنن کے تمام مشترک اور مخصوص طرق کا ذکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حدیث کے شروع سرے کو اتنا بیان کر کے کہ جس سے باقی حدیث کی یاد دہانی ہو جائے اس کی تمام اسانید کو

بالاستیعاب بیان کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا پیڑہ دے دیا جاتا ہے کہ جن میں یہ حدیث مروی ہے، اس موضوع پر بہت سے حفاظ حدیث نے داد تحقیق دی ہے، ان میں سب سے پہلے جن بزرگ نے صحیحین پر اطراف لکھے ہیں، وہ حافظ ابو مسعود دمشقی ۴۰۱ھ ہیں۔ ان کے بعد حافظ ابو محمد خلف بن محمد ۴۰۱ھ، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی یہ علمی خدمت انجام دی ہے۔

صحیحین کے علاوہ کتب خمسہ کے اطراف حافظ احمد بن ثابت ازدی نے بھی لکھے، اور کتب ستہ کے اطراف لکھنے والے یہ بزرگ ہیں: حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ، حافظ ابو الحجاج جمال الدین المزنی ۶۴۲ھ، حافظ شمس الدین ابوالحسن محمد بن علی الحسینی الدمشقی، حافظ ابوالقاسم بن عساکر، حافظ سراج الدین ابو حفص عمر بن نور الدین علی بن احمد الانصاری المعروف بابن الملقن، اس کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابوں کے اطراف لکھے گئے ہیں، حافظ ابن طاہر نے امام اعظم کی احادیث پر اطراف لکھے ہیں، جس کا نام ”اطراف احادیث ابی حنیفہ“ ہے۔ (امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور علم الحدیث، مولانا محمد علی کاندھلویؒ، ص ۴۹۸)

مصنّفین صحاح ستہ کی نسبی اور وطنی نسبت

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحاح ستہ کے مصنّفین سب کے سب وطنی اعتبار سے عجم سے تعلق رکھتے ہیں؛ چنانچہ امام بخاریؒ کا وطن بخارا ہے، امام مسلمؒ کا وطن نیشاپور بھی اسی کے قریب واقع ہے۔ امام ترمذیؒ، ترمذ سے تعلق رکھتے ہیں جو دریائے جیحون کے ساحل پر واقع ہے اور روس میں شامل رہا ہے۔ امام ابوداؤد سجستان کے ہیں، جو سیستان کا معرب ہے ایک قول کے مطابق سندھ و ہرات کے درمیان ایک خطہ کا نام ہے جو قندھار سے متصل ہے۔ ابن خلکان کے بقول بصرہ کے قریب ایک قریہ ہے؛ مگر قول اول ہی صحیح ہے۔ اس وقت یہ خطہ ایران کا ایک حصہ ہے۔ امام نسائی کا وطن ”نسا“ ہے۔ جو شہر مرو کے قریب خراسان کا ایک شہر ہے۔ امام ابن ماجہ قزوین سے تعلق رکھتے ہیں، جو عراق عجم کا مشہور شہر ہے۔ اور ایران کے صوبے آذربائیجان میں واقع ہے۔

البتہ وطن کے اعتبار سے عجمی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب کے سب فارسی النسل تھے؛ بلکہ ان میں سے صرف امام بخاریؒ اور ابن ماجہؒ فارسی النسل ہیں۔ باقی سارے حضرات عربی النسل ہیں۔ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ فرماتے ہیں:

”تجربہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب اور نواب صدیق حسن خاں نے مصنّفین ”صحاح ستہ“ کو

اہل فارس میں شمار کیا ہے؛ حالانکہ تاریخ سے بہ جز امام بخاری یا امام ابن ماجہ کے اور کسی کا فارسی النسل ہونا ثابت نہیں، امام مسلم کے متعلق خود علامہ نوویؒ کی تصریح موجود ہے۔ ”القشیری نسباً نیساپوری وطناء، عربی صلیبۃ“ اور امام ابواؤدازدی ہیں، امام ترمذیؒ سلمیٰ“ (امام ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۸)

ائمہ ستہ کی عالی سندیں

امام بخاریؒ کی عالی سند

امام بخاریؒ کی عالی سند ثلاثیات ہے۔ یعنی امام بخاریؒ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں۔ صحیح بخاری میں کل بائیس ثلاثیات ہیں، جو تین صحابہ حضرت سلمہ بن اکوع، حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ ان ثلاثیات میں امام بخاریؒ کے پانچ اساتذہ ہیں، مکی بن ابراہیم، ابوعاصم النبیل، محمد بن عبداللہ الانصاری، خلاد بن یحییٰ اور عصام بن خالد۔

ان بائیس میں سے گیارہ روایات تنہا مکی بن ابراہیم کی ہیں، جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ہیں۔

امام ترمذیؒ کی عالی سند

امام ترمذیؒ کی عالی سند ثلاثیات ہے اور پوری ترمذی میں ایک ہی ثلاثی روایت ہے، جس میں امام ترمذیؒ کے استاذ اسماعیل بن موسیٰ الکوفی ہیں۔ ان کے شیخ عمر بن شاکر ہیں اور وہ صحابی رسول حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ (دیکھئے: ترمذی، حدیث: ۲۲۶۰)

امام ابن ماجہؒ کی عالی سند

امام ابن ماجہؒ کی عالی سند ثلاثیات ہے، ابن ماجہ میں پانچ ثلاثیات ہیں اور پانچوں ایک ہی سند عن جبارۃ بن مغلس عن کثیر بن سلیم عن أنس بن مالك مروی ہیں۔ (روایات کے لیے دیکھیے: کتاب الاطعمۃ میں باب الوضوء عند الطعام، باب الشوار اور باب الضیافۃ، نیز کتاب الطب میں باب الحجلۃ اور کتاب الزہد میں باب صفۃ امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

امام مسلمؒ کی عالی سند

امام مسلمؒ کی عالی سند رباعی ہے۔ مسلم شریف میں ایک بھی ثلاثی روایت نہیں ہے۔ تاہم بہ کثرت ایسی روایات ہیں جن میں امام مسلمؒ اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان صرف چار وسائط ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں امام مسلمؒ کے یہاں وسائط کم ہیں اور امام بخاریؒ کے یہاں زیادہ ہیں۔ مثلاً امام مسلمؒ کے یہاں اگر وہ روایت رباعی ہے تو امام بخاریؒ کے یہاں وہ روایت خماسی ہے۔ اگر امام مسلمؒ کے یہاں خماسی ہے تو امام بخاریؒ کے یہاں روایت سداسی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب ”عوالی مسلم“ ایسی کل چالیس روایات جمع کر دی ہیں۔ یہ گویا امام مسلمؒ کے لیے ایک گونہ فضیلت کی چیز ہے۔ (دیکھیے: مباحث فی الحدیث وعلومہ ص ۲۸۴-۲۸۵)

امام نسائیؒ اور ابوداؤدؒ کی عالی سندیں

امام نسائیؒ کی سب سے عالی سند رباعی ہے۔ اسی طرح امام ابوداؤدؒ کی بھی عالی سند رباعی ہے۔ سنن داؤد میں کل ۲۶۷ رباعی روایات ہیں۔ اور ایک بھی ثلاثی روایت نہیں ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانیؒ، مصنفین صحاح ستہ کی اسانید عالیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مصنفین صحاح ستہ میں سے امام بخاریؒ، امام ابن ماجہؒ، امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے بھی بعض تبع تابعین کو دیکھا اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ اس بنا پر اس علو اسناد میں وہ بھی امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے ساتھ شریک ہیں؛ حالاں کہ امام شافعیؒ کی وفات کے وقت امام بخاریؒ دس برس کے تھے۔ اور امام ابوداؤدؒ کل دو سال کے اور امام ابن ماجہؒ تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے؛ چنانچہ ان حضرات کی تصانیف میں ثلاثیات حسب ذیل ہیں:

(۱) صحیح بخاری ۲۲- (۲) سنن ابن ماجہ ۵- (۳) سنن ابی داؤد ۱- (۴) جامع ترمذی ۱-

امام مسلمؒ اور امام نسائیؒ کو کسی تبع تابعی سے کوئی روایت نہ مل سکی؛ اس لیے ان دونوں حضرات کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں، جن کو ان کے اساتذہ نے تبع تابعین سے اور انھوں نے تابعین سے اور انھوں نے صحابہ سے سنا ہے۔ سنن ابن ماجہؒ میں بھی رباعیات بکثرت موجود ہیں اور اس اعتبار سے امام ابن ماجہؒ کو دیگر ارباب صحاح ستہ پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کہ امام بخاریؒ کے بعد ان کی ثلاثیات کی تعداد سب سے زیادہ ہے؛ حالاں کہ وہ عمر میں امام مسلمؒ

سے پانچ سال اور امام ابو داؤد سے سات سال چھوٹے ہیں۔“ (امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۱۹)
تنبیہ: اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صحاح ستہ میں سے فقط صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی میں ثلاثی روایات ہیں۔ ان کے علاوہ صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابی داؤد میں ایک بھی ثلاثی روایت نہیں ہے؛ لہذا مولانا نعمانیؒ کا ابو داؤد شریف میں بھی ایک ثلاثی روایت ہونے کا قول محل نظر ہے۔ غالباً اس اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ دراصل بہت پہلے حافظ شمس الدین سخاویؒ باب فی الحوض کی ایک روایت کو ثلاثی کہہ چکے ہیں۔ (فتح المغیث ۳/۳۵۷) لیکن درحقیقت وہ بھی رباعی ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کو رباعی فی حکم الثلاثی کہہ سکتے ہیں؛ اس لیے کہ دوراوی ابوطالوت اور ان کے شیخ جو یہاں مجہول ہیں، ایک ہی طبقہ (تابعی) سے تعلق رکھتے ہیں۔

مصنفین کتب ستہ کی نازل سندیں

امام بخاریؒ کی سب سے نازل سند تساعی ہے۔ یعنی وہ روایت جس میں امام بخاریؒ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان نو واسطے ہیں۔ اور اسی تساعی روایت بخاری میں صرف ایک ہے۔ (دیکھیے: کتاب الفتن، باب یا جوج ماجوج، حدیث نمبر: ۱۰۵۶)
 امام مسلمؒ کی بھی سند نازل تساعی ہے۔ (دیکھیے: حدیث نمبر: ۱۵۰۰ اور حدیث نمبر: ۲۳۹۰)
 امام ابو داؤدؒ کی نازل سند محشاری ہے اور ایسی ایک ہی روایت سنن ابی داؤد میں ہے۔ (دیکھیے: حدیث نمبر: ۳۲۹۲)

امام نسائیؒ کی بھی سند نازل محشاری ہے؛ چنانچہ ”باب الفضل فی قرارۃ قتل ہو اللہ احد“ کے تحت روایت نقل کر کے امام نسائیؒ فرماتے ہیں: ”مأعرف إسناده أطول من هذا“۔
 امام ترمذیؒ کی بھی سب سے نازل سند محشاری ہے؛ چنانچہ امام ترمذیؒ نے بھی ایک حدیث میں وہی سند ذکر کی ہے، جس کا تذکرہ نسائی کے حوالے سے اوپر کیا گیا۔

امام ابن ماجہؒ کی سند نازل تساعی ہے اور اس سند سے باب فی الایمان میں روایت نقل کرنے کے بعد ابن ماجہؒ فرماتے ہیں: ”قال ابو الصلت: لو قرئ هذا الإسناد علی مجنون لبرأ“ (اس سند کو اگر کسی مجنون پر پڑھ دیا جائے تو اس کا پاگل پن جاتا رہے) (تفصیلات کے لیے: مباحث فی الحدیث وعلومہ، از حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب مظاہریؒ)

ہماری اخلاقی پستی، مظلومیت اور ذلت کا اصل سبب خواص امت کی خدمت میں ایک خادمانہ عرضداشت

از: یحییٰ نعمانی

مسلمانوں کی گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ ذلتوں، نکتوں اور المناک مظالم سے بھری ہوئی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے حصے میں بھی اس خونچکاں تاریخ کے زخم آئے ہیں، بے چارگی کا حال یہ ہے کہ بقول شاعر گویا ان کی قسمت ہی یہ ہو کہ:

گلر پر زخم لیں گے، زخم پر مر ہم نہیں لیں گے

ایک زخم پر مر ہم نہیں رکھا جاتا کہ دوسرے زخم لگا دیا جاتا ہے، ان کی کمزوری اور ذلت و بے چارگی روز افزوں ہے، وہ صرف دوسروں کے رحم و کرم پر ہیں، اور کوئی راہ حالات کے بہتر ہونے کی نظر نہیں آتی۔ مسلمان اپنی مظلومیت پر ماتم کرتے ہیں۔ اس سے فارغ ہوتے ہیں تو احتجاج کر لیتے ہیں، دیوانے چیخ لیتے ہیں، فرزانے فلسفیانہ غور و فکر میں مشغول ہو کر دل بہلا لیتے ہیں۔ اس سے مایوس ہوتے ہیں تو قیادت نہ ہونے کا شکوہ کر لیتے ہیں یا دشمنوں پر تبر اڑھ لیتے ہیں؛ مگر حق یہ ہے کہ حالات کے بدلنے کی کسی کو کوئی راست تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

کوششیں سب دم توڑ گئیں، اور امیدوں نے اندھیروں کی چادر اوڑھ لی۔ اس محیط مایوسی اور ہمہ جہت ناکامی کا ایک بنیادی سبب ہماری شدید پستی اخلاقی ہے۔ ایسی ابترا اخلاقی حالت جو بڑی سے بڑی قوم کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی، جس نے ہر کام بگاڑ دیا ہے اور ہر کوشش ناکام کر دی ہے۔

حالات کے بھنور میں پھنسی کسی قوم کی کشتی کو کنارے لگانا، اس طبقے کا کام ہوتا ہے جو عقل و خرد اور سماجی مرتبے میں ”خواص“ کے درجے کا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں یہی طبقہ قیادت کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس ذہانت و فراست، ہمت و حوصلہ، اثار و بے لوثی،

حقیقت پسندی اور غیرت مندی کی صفات سے متصف خواص کی ایک جماعت ہوتی ہے تو وہ پوری قوم میں عزم، جوش عمل، صبر و برداشت، حالات کی تبدیلی کے لیے قربانیوں کا مزاج اور ظلم سے نبرد آزمائی کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے وہ کمزور قوم گوہر کردار سے مزین اور قوت عزم سے مسلح ہو کر حالات کے گرداب سے ابھر آتی ہے۔ اور پھر اس کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، جس میں وہ ثابت کر دیتی ہے کہ انصاف اور طاقت کے سلسلے میں قلت و کثرت بے معنی اور غیر مؤثر باتیں ہیں؛ مگر جب طبقہ خواص میں کردار کی بنیادوں میں پانی مرنے لگتا ہے اور اخلاق کے شجر پُربہار کی جڑیں دیمک زدہ ہو جاتی ہیں تو اس قوم کو حالات کی ستم ظریفیوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ قرآن نے بھی یہی قاعدہ بیان کیا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بھی اسی اصول کی تفسیر ہے۔

اب ذرا غور کیجیے! ہماری قوم میں آپ جن افراد اور گروہوں کو اس ”خواص“ کے طبقے میں شامل کر سکتے ہیں، ذرا ان کی اپنے ذہن میں نشان دہی کر لیجیے۔ آپ کے ذہن میں جو تصویریں اور کردار ابھریں ان کو پہچان لیجیے، سوچ لیجیے یہ کون لوگ ہیں۔ اور خدا کے واسطے سے یہ حقیر خادم التجا کرتا ہے کہ اگر آپ کو اس میں کہیں اپنی ذات بھی نظر آئے تو اس کو بھی نظر انداز نہ فرمائیے۔ ان میں ہماری قوم کے تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات آتے ہیں، ان میں علماء بھی آئیں گے، بڑے تاجر بھی آئیں گے، قومی تنظیموں کے لوگ بھی شامل ہوں گے اور ملی اور قومی اداروں کے ذمہ دار بھی۔ میڈیا اور صحافت سے وابستہ حضرات اور سیاسی میدان میں مختلف سطحوں پر سرگرم افراد اور وہ تمام لوگ اس دائرے میں آتے ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعیت میں کسی بھی نمائندگی یا قیادت کی پوزیشن میں سمجھے جاتے ہیں، یہ سب لوگ مسلمانوں کے خواص ہیں اور ملت کے اچھے برے کے ذمہ دار بھی۔

ذرا سوچیں اور ذرا حقیقت پسندی؛ بلکہ بے باکی کے ساتھ سوچیں! ہمارے اس سربراہِ آورہ طبقے کا اخلاقی کردار کس سطح کا ہے؟ اس میں کس قدر خلوص، بے لوثی اور ایثار کی صفت ہے؟ اپنی مظلوم فریادی قوم کے لیے ان کی درد مندی کا کیا حال ہے؟ کیا یہ خودداری، غیرت مندی اور بے نیازی کی شان رکھتے ہیں؟ ان میں کتنی بلند حوصلگی اور عالی ہمتی ہے؟ کیا سیم و زران کے پائے استغناء کے بو سے لیتے نظر آتے ہیں؟ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کیا شہرت اور منصب ان کی اصول پسندی اور رفعتِ کردار کو متاثر کرنے میں ناکام رہتے ہیں؟ اور اگر قومی مصلحت ان کے ذاتی

مفادات اور امنگوں کی قربانی مانگے تو یہ اس امتحان میں کتنے کامیاب ہو سکتے ہیں؟ خواص کی اخلاقی حالت جاننے کی کسوٹی اسی قسم کے سوالات ہیں۔

یقیناً آپ کے ذہن میں ان سوالوں کے جو جواب آئے ہوں گے وہ مایوس کن ہوں گے، اگر آپ اپنی قوم کو مظلوم اور کمزور جانتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کی طاقتیں اس کے خلاف سازشوں اور ستم رانیوں میں مصروف ہیں تو یقیناً آپ کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ ان مصائب سے نجات پانے کے لیے آپ کی قوم کو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتحاد اور باہمی تعاون و مدد کا مزاج ہے؛ مگر جان لیجیے کہ ہمارا جو اخلاقی حال ہے، اس سے سب سے پہلے قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اتحاد کی پہلی شرط ایمان دارانہ حق شناسی، دوسروں کی برتری کا شریفانہ اعتراف اور ایثار جیسی صفات ہیں۔ اگر خواص میں حق شناسی نہ ہو، ایمانداری کے ساتھ دوسروں کے مرتبے اور فوقیت کا اعتراف نہ ہو، اور کم از کم درجے کا بھی ایثار نہ ہو، اور ان صفات کی جگہ عالم یہ ہو کہ ہر شخص اپنی ذات کا اسیر اور خود کی عبادت میں مصروف ہو تو یقیناً نفسی نفسی کا عالم ہی قائم نظر آئے گا۔ آج جو امتیاز مسلمانوں کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے وہ اخلاق کی اسی بیماری کی دین ہے۔ اس بیماری کی شدت کے باوجود اپنی صفوں میں اتحاد کی توقع کرنا ایسا ہی ہے کہ آپ کسی بیمار و لاغر سے توقع کریں کہ وہ کسی بڑے پہلوان کو چت کر دے۔

اتحاد کے بعد دوسری چیز جو خواص کی اخلاقی پستی سے ریزہ ریزہ ہوتی ہے، وہ ہے قوم کا اپنی قیادت پر اعتماد۔ قیادت پر سے اعتماد اٹھنے کے بعد عوام مایوس اور بے عزم ہو جاتے ہیں اور کسی جدوجہد اور تحریک میں سرگرم نہیں ہوتے۔ جب ان کو کسی قربانی کے لیے پکارا جاتا ہے تو وہ دعوت صدابہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ وہ کوئی رہنمائی قبول نہیں کرتے۔ ان کے لیے اپنے پرائے اور ناصح و بدخواہ برابر ہو جاتے ہیں اور وہ ہزار آگاہیوں کے باوجود کسی دشمن اور بدخواہ سے پرہیز نہیں کرتے۔ آپ کو قوم کے ساتھ نہ دینے کا شکوہ ہے، بجا ہے؛ مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ خواص کے موجودہ حال کے ہوتے ہوئے عوام اعتبار و اعتماد کا حوصلہ کہاں سے لائیں۔ ہم مسلمانوں کی بے عملی کا شکوہ کرتے ہیں، کیا اس کے اس بنیادی سبب پر بھی غور کرتے ہیں جس نے ان سے ان کی امیدیں چھین لی ہیں؟؟

اسی کے ساتھ تیسرا سانحہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے اور بیگانوں دونوں کی نگاہ میں قیادت کا وقار اور بھرم جاتا رہتا ہے۔ انھیں باتوں کا نتیجہ ہے کہ اکثر ہماری ملی قیادت حکمرانوں اور ذلیل قسم کے

سیاست دانوں اور حقیر افسران کا کھلونا بن جاتی ہے، جو ہمیں جہاں چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جس کام میں چاہتا ہے لگا دیتا ہے۔

قومی اصلاح و ترقی کا یہ اصول ہے کہ نجی سطح کے عوام اپنے سربر آوردہ طبقات کے تابع ہوتے ہیں۔ خواص اگر اصول پسندی، بے غرضی، ایثار، سچائی، اعتراف و حق گوئی، انصاف اور مقصدیت کی صفات کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً ان کے کردار کے اثرات پوری قوم پر پڑیں گے۔ اور اگر عوام کو یہ نظر آئے گا کہ چہار طرف حقیر ذاتی اغراض کا بول بالا ہے، ان کا اکثر تجربہ یہ ہو کہ جس خوش نما ظاہر کی چادر کو اٹھایا جائے اندر سے مالِ طلبی اور شہرتِ طلبی کی بھدی رنگت ہی نظر آتی ہے تو پھر ان کے عقل و شعور اسی کے عادی ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا میں یہی جینے کا طریقہ ہے۔ اس صورت حال کا جو سب سے مضر؛ بلکہ مہلک پہلو ہے، وہ یہ کہ قوم کے جو باشعور دردمند اس پست اخلاقی سطح سے بلند بھی ہوتے ہیں، ماحول کی مایوسیاں ان کے حوصلوں کی لگام کھینچ لیتی ہیں اور وہ کسی خاموشی کے غار میں بیٹھ رہنے میں ہی عافیت اور اپنے دین و دل کی خیر اور عزت و آبرو کی سلامتی سمجھتے ہیں۔

عوام کی سطح کے لوگوں کو تو جانے دیجیے، خواص اور قیادت کے درجے پر فائز طبقے کی افسوسناک اخلاقی صورت حال سب کے سامنے ہے۔ یقیناً ان میں بعض اپنی ذاتی خصوصیات میں نہایت لائق ستائش اور قابل تحسین کردار کے حامل ہیں۔ ان میں اہل تقویٰ علماء بھی ہیں، زہدانِ شب زندہ دار بھی ہیں، شریف الطبع قائدین بھی ہیں اور عالی دماغ دانشوران بھی؛ مگر جسے آپ اجتماعی اخلاق کہتے ہیں، اس میں خواص کہلانے والوں کا حال بھی معیاری نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اصول پسندی کی جگہ ہماری قیادتوں کا شبیہ مطلب پرستی اور اغراض کی رعایت ہو چکا ہے۔ جس کو جس موقف اور کام میں فائدہ نظر آتا ہے وہ اس کی بھرپور کالٹ کمالِ دلسوزی اور خلوص کے مظاہرے کے ساتھ کرتا ہے۔ یقین کیجیے راقمِ سطور کا مقصد نہ کوئی شخص ہے، نہ کوئی جماعت و طبقہ؛ اس عاجز نے انگشت نمائی کے شبہ سے بچنے کے لیے اجمال ہی کو بہتر جانا ہے اور مفید مطلب ہونے اور اس عرض داشت کی تاثیر و افادیت میں اضافے کی توقع کے باوجود کچھ صاف مثالیں دینے سے عہد اُپر ہیز کیا ہے۔

نوعمری میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ایک بات بار بار سنی تھی، فرماتے تھے: ہماری قوم سے اجتماعی کاموں کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ اجتماعی کام اجتماعی

اخلاقیات سے ہوا کرتے ہیں، اور یہاں اجتماعی اخلاقیات تو کیا ذاتی اور انفرادی شریفانہ صفات بھی کم لوگوں کے یہاں ملتی ہیں۔ یہی بات بعد میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حوالے سے سنی۔ ملت کے دو حکیم جب ایک ہی نتیجے پر پہنچیں تو کیا شبہ یہی اصل مرض ہے باقی سب نتائج و مظاہر ہیں۔

یہ حقیر اولاً تو کسی شمار و قطار میں نہیں، پھر کردار کا وہ خود مفلس ہے۔ اس کا بند قبا ایسا تار تار ہے کہ پاکی داماں کی حکایت کا کیا سوال؟ مقصد نہ کسی کی تخفیف، نہ کسی حلقے کی طرف انگشت نمائی۔ جو کچھ مقصد ہے وہ یہ کہ اپنے اس سب سے اہم مسئلے پر کچھ سوچ بچار کیا جائے کہ یہ مظلومیت اور ذلت و نکبت کی کالی گھٹا کیوں نہیں چھٹ رہی؟ ہم سرزمین ہند کی سب سے باعزت قوم کے مقام سے گر کر سب سے حقیر، سب سے کمزور، اور سب سے ذلیل کیوں ہو گئے؟ اس ملک میں اگر کوئی جنگی بلا مار دے تو اس کے لیے سزا ہے؛ مگر کوئی مسلمان کا خون بہائے تو وہ لیڈر بن جاتا ہے۔ سب قوموں پر برے دن آئے اور رخصت ہو گئے؛ مگر ہماری پستی عروج آشنا ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہی؟ نکبت و ذلت کے اس اندھے غار سے باہر آنے کی ہماری کوئی کوشش کامیاب کیوں نہیں ہو رہی؟

بے اصولیوں کی مثالیں ہمارے اطراف میں اس قدر بھری پڑی ہیں کہ کسی نشاندہی کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں نے جو تعلیمی ادارے کاروباری مقصد اور ذاتی مالی فائدوں کے لیے قائم کیے ہیں وہ تو مارکیٹ کے معیار کے ہیں؛ مگر دوسری طرف ذرا سوچیے، مسلمانوں کے پاس اس ملک میں کتنے ایسے تعلیمی ادارے ہیں جو قومی ترقی اور رفاه و فلاح کے مقاصد کی خاطر قائم کیے گئے تھے، ان کا تعلیمی اور انتظامی حال دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔

اعلیٰ درجے کے خواص کے اندر تنگ نظری کا جب یہ حال ہو کہ ایک کام اگر ان کی قیادت و سربراہی میں انجام پائے تو اس کی ضرورت ایسی کہ ملت کی بقا اسی پر منحصر بتلائیں، ہمہ وقت اسی کی اہمیت پر زور دیں اور تمام خلق کو اس میں مشغول ہونے کی دعوت۔ پھر اگر اس کی سربراہی کسی اور کو منتقل ہو جائے تو اب اس کا تذکرہ ہی نہیں، نہ کسی کو اس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ تنگ نظری ہی نہیں بے مقصدیت بھی ہے۔

شہرت طلبی نے ہمارے ہر کام کو محض نمائشی بنا دیا ہے۔ ہر ایک کو بس اس کی فکر ہے کہ اس کی اور اس کے کام کی کتنی تحسین ہو رہی ہے۔ اپنی خبریں چھپوانے کے لیے اخبارات کو اشتہارات سے

نوازاجاتا ہے۔ کام کو اشتہار کی ضرورت ہو تو وہ بجا؛ مگر یہاں اشتہار کام کی ضرورت کے لیے نہیں بلکہ کام اشتہار کی ضرورت کے لیے ہو گیا ہے۔ پستیوں نے تھاہ چھولی ہے، ہمارا کوئی عزیز وہ ڈگری اگر لے لے جو ہندوستان کے ہزاروں لوگ لیتے رہتے ہیں تو ہم اخبار میں اشتہار دے دے کے اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ عوام ایسی سستی حرکتیں کریں تو کم افسوس کیا جائے؛ مگر جب خواص اس پست درجے پر آجائیں تو یہ کسی قوم کی بربادی کی حتمی نشانی ہے۔

خود غرضی اور مفاد طلبی نے ہر اندازے سے تجاوز کر لیا ہے۔ ہماری اس کمزور؛ بلکہ ذلیل کیفیت کو وقت کے تمام حکمرانوں نے خوب سمجھ لیا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ برطانیہ میں تعینات ہندوستانی سفیر سے مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں بات کرنے گئے۔ بعض مسائل پر ان کو توجہ دلانے کے بعد جب گفتگو اختتام کو پہنچی سفیر صاحب نے سوال کیا اور کچھ؟ جواب نفی میں دیا گیا تو سفیر صاحب نے زیادہ صراحت سے پوچھا اپنی کوئی ضرورت بتلائیں، ان بزرگ نے فرمایا: نہیں! یہ بات ان سفیر صاحب کے لیے کافی تعجب کی تھی۔ کہنے لگے آپ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی کوئی ضرورت نہیں بتلائی، ورنہ مسائل تو عنوان ہوتے ہیں، اصل بات تو کچھ ذاتی ہی ہوتی ہے؟

یہ فسادِ نیت اور پستی کردار ہم سے ہرنا کردنی کر سکتی ہے۔ ہم مسلمانوں کے قاتلوں سے بغل گیر ہو سکتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے خلاف ہر سازش کی حمایت بھی کر سکتے ہیں۔ کسی خاص سازشی اقدام کا نام کیا لیا جائے؟ جب کوئی حکومت کوئی ایسا قدم اٹھاتی ہے جس سے مسلمانوں کو اور ان کے دینی و ملی کردار کو نقصان پہونچانا مقصود ہوتا ہے تو ہمارے خواص کے طبقے سے اس کی پوری وکالت بھی کروانے میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ افسوس! اچھے اچھے لوگ اپنے مفادات و مصالح کی خاطر حکومتوں کے ایسے اقدامات کی تائید؛ بلکہ ان کا حصہ بننے پر راضی ہو جاتے ہیں، جن کے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ مال و جاہ کے سامنے نہ قائدین کو اپنی حیثیت عرفی کی پروا رہتی ہے، نہ علماء کو جبہ و دستار کی عظمت کا خیال اور نہ اللہ کے سامنے اس منافقانہ عمل کی باز پرس کا خوف۔

آپسی تنافس نے بھی ہمیں نہایت نقصان پہونچایا ہے۔ مجھے صاف عرض کرنا مشکل ہو رہا ہے؛ مگر یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اگر ہماری ہر تنظیم مسلمانوں کے مسائل کے بجائے اپنی نمائندگی اور حلقہ اثر بڑھانے ہی کو عملاً اصل مقصد اور اولین ترجیح بنائے گی تو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا یہ لامتناہی شوق ہرنا کردنی کرانے کے لیے کافی ہے۔ اور پھر جب مات کر دینے کا کھیل

شروع ہو جائے تو اخلاق و اصول کہاں بچتے ہیں؟ افسوس جو تنظیمیں اور ادارے مسلمانوں کے مسائل کے حل اور دین کی خدمت کے مقصد سے قائم ہوتے ہیں، دھیرے دھیرے تنافس اور دیکھا دیکھی کام کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پھر انھیں ہر حکومت، ہر پارٹی اور ہر ایجنسی ہر طرح استعمال کرتی ہے۔

کسی مظلوم اور کمزور قوم کی قیادت کو اگر ذلت کے گرداب اور ظلم کے شکنجے سے خلاصی حاصل کرنی ہے اور طاقتور حکومتوں سے پنچہ آزمائی کرنی ہے تو اس کے لیے غیرت و حمیت کی طاقت پہلی شرط ہے۔ آج آپ جس معرکے میں ہیں، اس میں طمع و لالچ کی عشوہ طر ازیاں خوف کی لام بندیوں سے پہلے سامنے آتی ہیں؛ مگر ہم میں ”صاحب سلامت“ کا شوق اتنا پیدا ہو گیا ہے اور ہمیں سرکارِ دربار سے مرعوبیت نے اس بری طرح گھیرا ہے کہ اس کے ذکر سے بھی حیا مانع اور شرم دامن گیر ہے۔ افسوس و صد حیف! وہ امت جس کا اصول مال و زر اور حکومت و سلطنت سے بے پروائی تھا، اس کے خواص حقیر حکمرانوں؛ بلکہ افسران کی نظر عنایت کے لیے سراپا نیاز و مسکنت بنے ہوئے ہیں۔ ان کی مدح سرائی میں نہ صرف قلابے ملا تے ہیں؛ بلکہ ان کی رضا جوئی میں ہر رسوا کن قلابازی کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں ع

ہوس کی دھوم دھام ہے، نگر نگر، گلی گلی

قومی مقاصد، مال و منال اور حقیر نوکریوں کی بھینٹ چڑھا دیے جاتے ہیں۔ اس حقیر نے اچھے اچھے قائدین اور سماجی کارکنوں کی سرکارِ دربار میں ایسی عاجزی اور پنچھنے کی کیفیت کے متواتر قصے سن رکھے ہیں کہ شرمندگی سے سر جھکتا ہے۔ اب تو حال یہ ہے کہ حکمرانوں اور وزیروں کے کچھ گماشتے ہیں، جو جب ان کے آقا چاہتے ہیں وہ ان کے سامنے ہمارے رہنماؤں کی پریڈ کر دیتے ہیں اور جو چاہے بیان دلوادیتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں میں مسلمانوں کے جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تعداد نہایت حقیر اور پست قسم کے افراد کی ہے، جن کے انداز نشست و برخاست سے صرف ذاتی اغراض کی طلب ظاہر ہوتی ہے۔ مزید برآں ان پارٹیوں کے ساتھ ہماری ملی قیادت کا رویہ بھی نہایت مایوس کن ہے۔ بعض جماعتوں کے بارے میں مسلم عوام کا یہ تاثر بڑھتا جا رہا ہے کہ ان کے کردار کا ایک حصہ کسی سیاسی پارٹی کی حاشیہ برداری ہے۔ وہ ہزار صفائیاں دیں کہ سیاست کی وادی ان کی گزرگاہ نہیں؛ مگر عملاً ان کے رہنما ہمیشہ اسی کوچہ کے طواف میں مشغول نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تذکرہ نہ قوم کے رذیل و بدکردار لوگوں کا ہو رہا ہے، نہ عوام کا۔ یہ ہمارے اچھے لوگ ہیں، یہ قوم کی قیادت اور نمائندگی کے مقام بلند پر سرفراز لوگ ہیں۔ ہم اہل مغرب کو اخلاقی پستیوں کا بڑا طعنہ دیتے ہیں، یقیناً ان کے ظلم سے انسانیت خوں چکاں ہے اور ان کی بے حیا تہذیب نے آدمیت کے شرف کو داغدار کیا ہے؛ مگر آپ مغرب کے کسی سیاسی یا قومی نمائندے سے اپنی قوم کے مفاد کی ایسی قربانی کی توقع نہیں کر سکتے جیسی ہمارے نمائندے معمولی سی پیشکشوں پر روز دیتے ہیں۔ کسی یہودی تنظیم یا قابل ذکر نمائندے نے آج تک ہولوکاسٹ کو معاف نہیں کیا۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سکھوں کے ساتھ صرف ایک مرتبہ ۱۹۸۲ء کے فسادات کی شکل میں وہ پیش آیا جو ہمارے لیے روزمرہ کا قصہ ہے۔ کیا مجال کہ ان کا کوئی قومی نمائندہ اس کے حوالے سے کانگریس کی صفائی دینے کا ذلیل مظاہرہ کرے؛ مگر ہمارے نمائندوں کا کیا حال ہے، ہم جانتے ہیں۔ چھوٹے سے فائدوں کے لیے، ذاتی عزائم اور مفادات کے لیے ہم ذلت انگیز حد تک پستی اختیار کرنے کو تیار ہیں۔ افسوس کہ محمد عربی ﷺ کی امت کو کافروں سے بھی عبرت نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر علماء کے طبقے کو ہر ایمانی کمزوری اور ہر اخلاقی فساد کا معالج بنایا ہے۔ علماء کی جماعت کا اصل فریضہ ہی دین و اخلاق کے اعلیٰ معیار کی حفاظت ہے۔ اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کے علماء کہلانے والوں کا یہ ذکر نہیں، اہل حق میں شمار کیے جانے والوں میں سے ایک تعداد اسی پستی اور تنزل کا شکار ہے۔ ان سطروں کا لکھنے والا یہ حقیر و کمتر اور گونا گوں اخلاقی بیماریوں میں گرفتار کہاں سے علماء سے کچھ کہنے کا منہ لائے؟ علماء کے عزت و وقار میں کمی سے قوم کے دین کا بڑا نقصان ہے؛ اس لیے ڈر لگتا ہے کہ ان کو کچھ توجہ دلانے سے دوسری طرف کہیں دین کا یہ نقصان نہ ہو جائے۔ کیسے کچھ عرض کیا جائے، اور عرض کیے بغیر کیسے رہا جائے کہ حکیم ہی بیمار ہے اور افسوس کہ اپنی اس مہلک بیماری سے اکثر غافل ہیں۔

حیف کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا۔ ابھی کل کی بات ہے ایک غیرت فروش مولوی کہلانے والا بی جے پی کی کور کمیٹی کا ممبر ہے اور وہ ایک مدرسے میں جاتا ہے۔ مدرسے کے ذمہ داروں کا حال دیکھیے کہ اس شخص کو عین مدرسے کے اندر پریس کے نمائندوں سے مخاطب ہونے کا موقع دیا جاتا ہے، وہ مدرسے میں بیٹھ کر بی جے پی کی وکالت کرتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں علماء کو بی جے پی میں شامل کرانا چاہتا ہوں۔ سوچئے مدرسے کا ذمہ دار ہوتے ہوئے کوئی اس نفاق اور ملت

فروشی کا معاون بھی بن سکتا ہے! ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

ایک مدرسے کے ذمہ دار نے اپنی غیرت کو سرِ بازار اس طرح سولی دی کہ انتخابات میں ایک فلمی اداکارہ کے ساتھ خوب گھومے۔ اور اپنے دین کی قیمت یہ وصول کی کہ مدرسے میں اس کے پارلیمانی فنڈ سے تعمیری کام کروائے۔ کیا اب ”علماء“ کا ان زنا کے داعیوں اور داعیات سے بھی جوڑ ہو سکتا ہے؟ وہ صاحبہ پھر ان مولوی جی کے ہمراہ مدرسے میں قدم رنجہ بھی فرماتی ہیں اور مدرسے کی عمارت کا افتتاح بھی ان کے ”دستِ مبارک“ سے انجام پاتا ہے۔ اور ان سب نحوستوں اور ناپاکیوں کی باقاعدہ تصویریں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور فخر و سرور کے ساتھ لوگوں کو دکھائی جاتی ہیں۔ آپ یہ سوچ کر دل کو مت بہلا لیجیے گا کہ یہ تو کوئی ایک آدھ فرد کا بگاڑ ہے، جی نہیں! وہ صاحب ان سب کارناموں کے بعد بھی آپ کی جماعت میں مطعون نہیں قرار پاتے، وہ حسبِ سابق قابلِ قبول ہیں۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھیے۔

ذاتی عمل اور کردار میں اس درجے گر جانے والوں کی تعداد تو کچھ خاص نہیں؛ مگر اس پر بڑوں کی طرف سے قول اور عمل سے شدید نکیر اور تقدّر (گھن) کا اظہار نہ ہونے کی وجہ سے یہ پست اور فاسد عنصر اپنی تعداد لگا تار بڑھاتا جا رہا ہے۔

اس سے اوپر بھی علماء کی ایک خاصی تعداد ہے جو الحمد للہ ایسی پست تو نہیں؛ مگر اپنے کردار اور گفتار سے عوام کے اندر کچھ اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ ہمارے یہاں ہر طرف خاک اڑ رہی ہے۔ شہرت طلبی کی ایک ہوٹل لگی ہوئی ہے۔ ہر وقت اپنا اور اپنے چھوٹوں اور بڑوں کی ہی مدح و توصیف و طیرہ بنا ہوا ہے۔ اللہ والوں کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ اپنے بڑوں کے تذکرے سے بھی اپنی تعریف کی بو آئے تو وہ اس سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے حضرت کا بھی تذکرہ نہیں کرتا کہ اس میں بھی میری تعریف ہے۔ روزے نماز کی ظاہری دین داری کو اگر چھوڑ دیں تو ہم متاعِ دنیا کی تحقیر کے داعی ہو کر بھی کس قدر اسی کے پیچھے بھاگنے والے بنے ہوئے ہیں۔ وہی سود و سودا اور مکر و فن کی گرم بازاری، وہی مصنوعی گفتگوئیں۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ایک ذہین درد مند اپنے احساس کی اس گواہی کو چاہ کر بھی جھٹلا نہیں پاتا کہ ہماری تگ و دو کے عنوان کچھ اور ہوتے ہیں اور حقیقی مقاصد کچھ اور، کسی نام سے کانفرنس اور جلسہ ہوتا ہے اور اندر کی اصل نگاہ کسی اور چیز پر لگی ہوتی ہے۔

مدرسوں کے جلسوں میں سیاسی لیڈروں کا جو اکرام و اعزاز ہونے لگا ہے کبھی ہم نے سوچا

کہ اس کو دیکھ کر ہمارے چھوٹوں کے دل میں کیسی مرعوبیت پیدا ہوتی ہے؟ جب طلبہ اصحاب جبہ و دستار کو اہل دنیا کے سامنے بچھتے گرتے دیکھیں گے تو وہ کس کردار کے اٹھیں گے؟ ان کے خواب کیا ہوں گے؟ وہ اپنے لیے کس کردار کا انتخاب کریں گے؟ اور جب ان کے سامنے دین کے مفاد اور دنیا کی چمک دمک کا تصادم ہوگا تو وہ کیسے اپنے لیے استغناء اور اور غیرت و حمیت کی راہ چنیں گے؟ آہ! کہ زہد اور دنیا پر نزاری جس کی پیشانی کا نور ہوا کرتے تھے، آج وہ وزیروں اور بادشاہوں کا در یوزہ گر ہے۔

اس متوسط طبقے سے بھی اوپر ہمارا ایک طبقہ اور ہے؛ قابل رشک حد تک باصفا، ذاتی دین داری سے مزین اور لائق تقلید پاکیزگی کا پابند؛ مگر وہ اونچا خلاقی معیار اور با اصول کردار جو زمانے کے امام کا ہونا چاہیے، اور جس کے بغیر اس زبوں حال امت کا بھلا ہونے کی کوئی راہ زمانہ حاضر میں نہیں، اس طبقے نے بھی اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی ہمت کے پتوڑ رکھ دیے ہیں۔ جاہ و وقار میں منافست نے ہمیں اصحاب دنیا کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ ایک صاحب کو اس پر افسوس کرتے پایا گیا کہ ان کے بین الاقوامی سفر سال میں ایک آدھ ہی ہو پاتے ہیں اور فلاں صاحب کے کئی ایک۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس پست سوچ سے کیا کسی قوم کی گشتی بھنور سے نکل سکتی ہے۔ وہی گروہ بندیاں، وہی خلوص سے عاری محالمت اور وہی مفادات و مراعات کے زیر اثر فیصلے جو اہل دنیا کے لیے بھی ذلت ہی ہیں، ہمارے گروہوں میں داخل ہو گئی ہیں۔ ایک بزرگ کا یہ جملہ کان میں پڑا تھا کہ آج کی دنیا میں کوئی یہ نہیں چاہتا کہ برائی نہ ہو، ہر ایک بس یہ چاہتا ہے کہ برائی اس کے جھنڈے تلے ہو۔ ہمارے دینی قائدین کے یہاں جب یہ منظر دکھتا ہے کہ نہایت نامناسب؛ بلکہ منافقانہ کردار کے لوگ، جن سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچتا ہے، عزت و توقیر ہی نہیں تعاون اور مشارکت بھی پاتے ہیں تو الفاظ نہیں ملتے کہ کس قدر چھوٹوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ اب وہ کہاں سے یہ ہمت لائیں کہ معیار سے گری ہوئی حرکتوں سے ہر حال میں گریز کریں گے۔

اے کاش ہمارے یہ بزرگ سوچیں کہ ایسے دین دشمنوں اور ملت فروشوں کی جب ان کے رسوخ و طاقت کی وجہ سے یا کسی ایسی مصلحت کی بنیاد پر پذیرائی ہوتی ہے، جو بہر حال خالص دینی مصلحت نہیں ہوتی، تو ان کا یہ عمل عام درد مند مسلمانوں کے لیے کیسا مایوس کن اور ہمت شکن ہوتا ہے۔ مخلصانہ تنقید اور بے غرض روک ٹوک ایک قومی اور دینی ضرورت ہے جو موہوم و وقتی مصالح کے

لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ ہم کو سوچنا چاہیے کہ رسول اللہؐ نے ”انکارِ منکر“، یعنی خرابیوں پر ایک دوسرے کو متوجہ کرنے کی کس قدر تاکید فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ اس فریضے سے غفلت پر دنیا ہی میں اللہ کے عذاب کی وعید بھی سنائی ہے۔ اگر علماء اور وہ بھی بڑے علماء اپنی خوش نامی، تعلقات اور خوش رکھنے کے مقاصد سے اس فریضے کو چھوڑ دیں گے تو اخلاقی تنزل کے بھنور میں امت کی پھنسی کشتی نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔

یقیناً اللہ والوں کی ایک جماعت علماء میں ایسی ضرور ہے جو اخلاص وصدق، اور بے لوثی وپاکی میں نمونہ اور اسوہ کا درجہ رکھتی ہے؛ مگر عموماً ماحول ایسا ناسازگار ہے کہ وہ بس اپنے محدود دائروں کے اندر اپنے کردار کے دیے جلائے بیٹھے ہیں۔ ملی جدوجہد کے دائرے میں سود و سودا اور مکر و فن کی ایسی گرم بازاری ہے، اور دین و اخلاق کا ایسا نقصان نظر آتا ہے کہ جس کو ہودین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

کا سوال سامنے آنے کے بعد ایسے اچھے لوگ اپنے بڑھے پاؤں بھی کھینچ لیتے ہیں۔ تنافس کے ماحول اور صدق و وفا کی بہائے گراں مایہ کی شدید نادقدری کی وجہ سے ان لوگوں سے ہمارے اجتماعی معاملات میں قیادت اور رہنمائی کا جو فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا، وہ نہیں اٹھایا جا رہا۔

اے طبقہ خواص! آپ ہی ملت کی آبرو ہیں، خطروں میں گھری اور اندیشوں سے گھبرائی اس ملت کو اللہ کے بعد آپ ہی کا سہارا ہے۔ ان سطروں کا لکھنے والا اس وقت شدید کرب و الم سے دوچار ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں سوچتے وقت شرم و افسوس کے غم انگیز احساسات سے اس کی پیشانی عرق آلود ہے؛ مگر ”نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن“ کا معاملہ ہے۔ نہ خموشی کی تاب ہے اور نہ کہتے بنے ہے۔ یہ اخلاقی زوال ہمارے جسم ملی کا زخم ہے۔..... اور اپنے زخموں کو کریدنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر..... مگر زخم کو صاف کیے بغیر جب تک آپ اوپر اوپر کی مرہم پٹی کیے جائیں گے اندر کی عفونت اور سڑاند بڑھتی ہی رہے گی۔

محترم ان گرامی! مجھے خیال خاطر احباب چاہیے، اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ یہ لکھنے والا خود بھی ہزار خرابیوں اور گندگیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ناپاکیوں پر مستزاد اس کی بے عملی ہے۔ یہ کردار کا غازی کیا ہوتا، اس سے تو گفتار بھی نہیں آتی؛ مگر جہاں تک اندازہ ہے ان سطروں کا مقصد اپنی برائت نہیں ہے؛ مگر دل کا اصلی حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

یہ حقیر آپ کو اللہ کا اور دین و رسول ﷺ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہے، خدا را اپنے مقام اور ذمہ داری پر غور کیجیے! رحم کیجیے اس قوم پر، آپ ہی اس کے دین اور دنیا کے امین ہیں۔ یہ قوم آپ کی ہی تو آس لگائے بیٹھی ہے۔ اور یہ بھی آپ اور آپ جیسوں ہی کا شرف اور مقام ہے کہ اس امت کے مسائل اور مشکلات اگر حل ہوں گے تو آپ ہی کی قیادت میں۔ اگر خواص میں کمزوریاں ہیں تو بھی امت مسلمہ ان سے دست بردار اور بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اس کو آپ کی ضرورت ہے۔ کاش آپ کے سر پر آخرت میں رسول اللہ کی امت کی کامیابی کا سہرا بندھے۔

آپ اگر اصول پسندی اور سچائی اور ایثار کو نہیں اختیار کریں گے تو آپ جانتے ہیں کہ حالات ملک میں مسلمانوں کے لیے کس قسم کے اندیشوں کی آگاہی دے رہے ہیں۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ اپنے کسی ذاتی یا اپنے گروہ کے کسی فائدے کے لیے جو قدم اٹھا لیتے ہیں وہ سبب بنے گا مسلمانوں کی تباہی کا اور اللہ کے یہاں آپ کے حساب میں لکھا جائے گا کہ یہ بندہ مسلمانوں کے خون بہنے کا؛ بلکہ اس ملک میں اسلام کی شکست کا ذریعہ بنا۔ خدا نہ کرے ہم آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ایسے کسی جرم کے مجرم بنا کر حاضر کیے جائیں۔

یہ آپ کے ایک بھائی کی ایک خادمانہ عرضداشت ہے۔ ایک مدت سے اس کے دل میں آپ سے کچھ عرض کرنے کی تمننا تھی؛ مگر انتظار تھا کہ یہ کام کسی موقر بزرگ کی طرف سے انجام پائے؛ مگر پھر خیال ہوا کہ شاید جو پہلو اس عاجز کے ذہن میں ہیں، شاید وہ دوسروں کے ذہن میں نہ آسکیں۔ اللہ کے واسطے سنجیدگی سے مسئلے پر غور فرمائیں۔ اگر اپنے کسی موقف میں تبدیلی کی ضرورت محسوس فرمائیں تو آخرت میں اللہ کے عظیم اجر اور دنیا میں اس کی غیبی مدد و نصرت کی توقع کے ساتھ اس تبدیلی کو کر گزریں! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو!



ایمان و اعمال کے لیے مجاہدہ کی ضرورت

از: محمد ضمیر رشیدی

وارث پورہ، کامٹی، ناگپور

آم کی گٹھلی ہاتھوں میں لے کر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس گٹھلی کے اندر ایک سرسبز آم کا درخت، لکڑیوں کا ذخیرہ، آم کے انبار، گھنا سا یہ اور ٹھنڈی ہو اور غیر چھپی ہوئی ہے تو ہر شخص اس کے دعوے کی تائید کرے گا؛ کیوں کہ آم کی گٹھلی سے حاصل ہونے والے یہ سارے فائدے ہر کسی کے علم و مشاہدہ میں ہے؛ لیکن آم کی گٹھلی سے فائدہ حاصل کرنے کے امکان کو واقعہ بنانے کے لیے چند اصول و ضابطہ کی رعایت کے ساتھ ایک مخصوص محنت درکار ہے جس کے بغیر یہ سارے فائدے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ مثلاً گٹھلی کو زمین میں دبانا، کھاد پانی کا انتظام، جانوروں سے نگہداشت وغیرہ۔ اس کے برعکس اگر گٹھلی کو ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر کالج کی کسی الماری یا طغریٰ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ سجا کر رکھ دیا جائے اور روز آئے اس پر عطر پاشی اور اگر بتی کی دھونی دی جائے تو سالوں سال کی محنت کے باوجود بھی اس سے وہ نتیجہ یا فائدہ حاصل نہیں ہوگا جو اس سے مطلوب و مقصود ہے۔ حاصل یہ کہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محنت صحیح انداز پر ہو۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ قریش کے اشراف سے (جن میں ابوطالب، عتبہ، شیبہ، ابو جہل اور ابوسفیان وغیرہ شریک تھے) ایک مرتبہ یوں مخاطب ہوئے: ”لوگو! میں صرف ایک کلمہ کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع فرماں بردار ہوگا۔“ اس حدیث شریف میں جس کلمہ کا مطالبہ کیا گیا تھا، وہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ ہے۔ یہ توحید کا کلمہ ہے۔ یہ اللہ اور رسول ﷺ کی غلامی کا کلمہ ہے۔ یہ تسخیر کائنات کا کلمہ ہے؛ چنانچہ اس کلمہ کو پڑھنے کا مطالبہ اس اعتبار سے نہیں ہے جس طرح ہم بازار میں دکانوں کے نام پڑھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اگر اس کو پڑھنے سے ایسا ہی مقصود ہوتا تو عرب کے مشرکین اس کلمہ کو ضرور

پڑھ لیتے؛ مگر وہ بھی جانتے تھے کہ من چاہی اور رب چاہی دو ضد ہیں اور دو ضد بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہذا کلمہ کو پڑھنے کے بعد ہمیں من چاہی چھوڑ کر رب چاہی زندگی اختیار کرنی ہوگی اور اپنی پوری زندگی کو اسلام کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔

تاہم یہ کلمہ ایک محنت چاہتا ہے جس کی بناء پر انسان کی زندگی میں ایمان و یقین اور نیک اعمال کی بہار آتی ہے۔ اس کلمہ کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنے کے بعد ایمان و اعمال کو مرتبہ کمال تک پہنچانے کے لیے جدوجہد درکار ہے۔ کسی بندہ کو ہدایت عطا کرنے کی اللہ کی سنت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی طرف رجوع کرے، اس کی بارگاہ میں گر گڑائے، بلبلائے اور وزاری کرے غرضیکہ اللہ سے ہدایت کو اس طرح طلب کرے، جیسے کوئی بھکاری بھیک مانگتا ہے، نیز اس کے راستہ کی جدوجہد اختیار کرے کہ یہی چیزیں انسان کو ہدایت و توفیق سے قریب کرنے والی ہیں۔ اکثر انسان ہدایت کے اس معاملہ میں کفر و ضلالت اور گمراہی کی گھاٹیوں میں یہ سوچ کر پڑے رہ جاتے ہیں کہ جب ہدایت بھی اللہ کے ہی ہاتھوں میں ہے تو وہ ہمیں ہدایت کیوں نہیں دے دیتا۔ ٹھیک اسی طرح بعض کمزور علم و ایمان والے اہل ایمان، شیطان کے وساوس اور بہکاوے میں یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ توفیق دے گا تو عمل کریں گے۔ واضح ہونا چاہیے کہ ایمان کی ہدایت اور اعمال صالحہ کی توفیق صرف اسی بندہ کو ملتی ہے، جو خود اس کا طالب اور کوشاں ہو۔ یہی سنت اللہ ہے، نیز اللہ کی سنت تبدیل اور تحویل نہیں ہوتی اور اللہ بے نیاز ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ جب بندہ اللہ کی طرف چلتا ہے تو اس کی رحمت بندہ کی طرف دوڑ کر آتی ہے۔ گویا دیر بندہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ ورنہ اس کے الطاف تو بہت عام ہیں اور کسی انسان کو غریق رحمت کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ اگرچہ دنیا میں بے شمار انسان محنت کر رہے ہیں۔ تاہم یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اسی انسان کی محنت کامیاب و بامراد ہوگی جس کی محنت آل حضور ﷺ کی محنت کے اسلوب و نہج سے میل کھا جائے گی؛ چنانچہ خاتم الانبیاء ﷺ کی محنت کے اسلوب و طریقہ کار کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ”وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں، ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔“ (سورہ جمعہ۔ آیت نمبر ۲)

اس آیت کی روشنی میں ایمان کو راسخ کرنے اور ثابت قدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس آیت شریفہ کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائیں یعنی قرآن مجید کی آیتوں میں تدبر، تفکر کرنا اور اللہ کی

آیتیں کو پڑھ کر سنانا کہ یہ دعوت ہے اور دعوت کا خاصہ یقین پیدا کرنا ہے۔ دینی مجالس میں شرکت کرنا، ایمان کا مذاکرہ کرنا، اپنا تزکیہ کرنا، کتاب و حکمت سیکھنا۔ کلمہ پاک پڑھ کر ایمان کی بار بار تجدید کرنا، ذکر و فکر کی عادت ڈالنا۔ اللہ کے اوامر اور رسول اللہ کی سنتوں پر عمل آوری کہ اس کے ذریعے انسان ایمان کی حلاوت و لذت کو محسوس کر سکتا ہے۔ کائنات میں غور و فکر کرنا کہ یہ معرفت کی کنجی اور بہترین عبادت ہے؛ تاکہ مخلوق کے ذریعے سے اس کے خالق کو پہچانا جاسکے۔ اہل علم و اہل دل کی صحبت اختیار کرنا کہ اللہ تعالیٰ حکمت کے نور سے مردہ دل کو ایسا زندہ فرماتے ہیں جیسا کہ مردہ زمین زوردار بارش سے زندہ ہوتی ہے، شیطان و نفس کے وساوس سے بچنا، شک کو یقین سے بدلنا، آخرت کا تذکرہ تاکہ اس کا استحضار نصیب ہو، وغیرہ۔ الغرض ان اسباب و عوامل اور امور کی اتنی مشق کرنا کہ دین میں کامیابی کا شرح صدر حاصل ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے لیے جدوجہد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ حضرت بلال حبشی کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے سرفراز فرمایا تو کفار و مشرکین کی جانب سے انتہائی اذیت پہنچائے جانے کے باوجود ”احداحد“ کہا کرتے تھے۔

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔“ (سورہ

العنکبوت: ۶۹)



انسانی قانون کافی نہیں

انسانیت کو الہی قانون کی طرف لوٹنا ضروری

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی

15- گاندھی روڈ دہرہ دون

اس عظیم کائنات میں خالق کائنات کے عظیم الشان، پیچیدہ اور رنگارنگ مظاہر اور توانائیوں کی مختلف شکلوں کے درمیان کمزور سے حضرت انسان کی موجودگی بذات خود ایک معجزہ ہے۔ خالق کائنات کی مخلوقات ہوا، پانی، آگ، شمسی، قمری توانائی زیر زمین و زیر سمندر پائی جانے والی معدنیات پر غور کرنے سے انسان اپنی حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے، اگر وہ غور و فکر سے کام لے، مگر یہ حضرت تاریخ کے ہر دور میں عقل و دانش کی بدھنسی اور طاقت و دولت کے نشہ کا شکار ہو کر خود خالق کائنات کے خلاف ہی بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ انقلابِ فرانس کے بعد کے دورِ عقلیت پسندی اور خدا بیزاری میں یہ مرض سب سے شدید نظر آتا ہے جس میں دین و دنیا کی تفریق کے ساتھ یہ اصول طے پا گیا کہ ”ماضی کے تجربوں اور عقل کی روشنی میں انسان اپنے لیے خود قوانین بنا سکتا ہے۔“ اور اس طرح انسانی اجتماعی زندگی سے خدائی رہنمائی کو بے دخل کرنا ہی عقل پسند اور عقل مند، ترقی پسند وغیرہ وغیرہ ہونے کا پیمانہ مقرر ہوا۔ پچھلے 300/400 سالوں کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اس خط اور جنون میں مبتلا انسانوں نے اپنے ایوانوں اور تجربہ گاہوں سے جو قوانین بنائے وہ انسانیت کی تعمیر کے بجائے انسانیت کی بربادی کے لیے ہی کارآمد ثابت ہوئے۔ آزادی، جمہوریت، آزاد تجارت، صنفی مساوات کے نام پر جس طرح بظاہر چمک دمک دکھائی گئی؛ مگر آج پوری دنیا میں پھیلا سماجی، معاشی، اخلاقی، ماحولیاتی اسی خدا بیزار اور بے قید عقلی آزادی کا نتیجہ ہے۔ انسانیت روزانہ قسطوں میں اپنے تجربوں کی ہلاکت خیزیوں کی گواہ بن رہی ہے۔ اپنی بے قید عقلی آزادی کے فساد کا نظارہ کر رہی ہے۔ افراط و تفریط پر مبنی قانون سازیوں کے مہلک نتائج دیکھ رہی ہے؛ مگر خالق کائنات کی طرف رجوع ہونے کی توفیق نہیں ہو رہی ہے۔

صنعتی مساوات، انسانوں کے مابین معاشرتی تعلقات، مرد و زن کے دائرہ کار و آپسی تعلقات پر سپریم کورٹ کے دو فیصلے اور مساوات کے نام پر مصنوعی مساوات کے نتائج پر اس وقت دنیا میں محدود چند اعلیٰ ترین خاتون عہدے دار میں سے ایک Pepsi-Co کی بھارتی نژاد افسر اعلیٰ C.E.O. اندرانوئی Indira Nooyi کا اعترافی انٹرویو ہماری اور تمام انسانیت کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ انسان خود اپنا شارع تعبیر کسی الہی رہنمائی کے نہیں ہو سکتا۔ پہلے فیصلہ میں سپریم کورٹ نے ایک بینکر اور ایک بین الاقوامی ایئر لائن کے عملہ کی رکن کے درمیان ”لوان رلیشن شپ (Live-in-relationships) کے دو سال بعد خاتون کے ذریعہ زنا اور دھوکہ وغیرہ کا مقدمہ درج کرانے پر دہلی ہائی کورٹ کے فیصلہ پر کہ اس طرح کی الزام بازی کو مردوں سے بدلہ لینے یا شادی پر مجبور کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جسٹس وکرم جیت سن اور جسٹس ایس سنگھ کی Bench نے اس معاملہ سے متعلق قانونی سوالات کی جانچ کرنے کے لیے اتفاق کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا دو بالغ افراد کے درمیان مرضی سے بنا رشتہ ٹوٹنے پر ان دو سالوں کے رشتوں کی بنیاد پر جس میں جسمانی تعلقات شامل ہیں کو مرد کے خلاف زنا کے الزام کے لیے بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ دہلی ہائی کورٹ نے اس معاملہ میں کہا تھا ”ایسے بہت سارے معاملات دیکھنے کو مل رہے ہیں جن میں خاتون رضامندی سے جسمانی تعلقات بناتی ہیں پھر جب رشتہ ٹوٹتا ہے تو وہ قانون کو بدلہ لینے کے ہتھیار کی طرح استعمال کرتی ہیں، ایسا پیسہ جمع کرنے یا پھر لڑکے کو شادی کے لیے مجبور کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ (29 جون 2014 یو. این. آئی)

بہار کے ایک شخص کی طرف سے دائر پیشگی ضمانت کی درخواست پر سپریم کورٹ نے اپنے 4 جولائی 2014 کے فیصلہ میں جسٹس چندر موہلی کمار اور جسٹس پنا کی چندرا گھوش نے کہا کہ سپریم کورٹ جہیز مخالف قانون کے غلط استعمال پر تشویش کا اظہار کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں پولیس خود ہی ملزم کو گرفتار نہیں کر سکتی، اگر پولیس گرفتار کرتی ہے تو اسے گرفتاری کی وجہ بتانی ہوگی۔ جس کا عدالتی جائزہ لیا جائے گا۔ جہیزی اموات کے قانون مجریہ 1983 کی دفعہ 498 کے تحت متاثرہ خاتون کے ذریعہ نامزد ملزمان کو پولیس سب سے پہلے گرفتار کرتی ہے، پھر تحقیقات شروع کرتی ہے۔ فیصلہ میں کہا گیا کہ دفعہ از خود نوٹس اور غیر ضمانتی دفعہ ہونے کی وجہ سے غیر مطمئن بیویاں اس کا استعمال دفاع کے بجائے ہتھیار کے طور پر کر رہی ہیں؟ عدالت نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ سال 2012 میں اس دفعہ کے تحت گرفتار ہونے والوں میں ایک چوتھائی خواتین تھیں، جو زیادہ تر ملزم شوہروں کی مائیں اور بہنیں تھیں۔ عدالت نے کہا ”ہمیں یقین ہے

کہ کوئی بھی گرفتاری صرف اس لیے نہیں کی جانی چاہیے کہ دفعہ از خود نوٹس اور غیر ضمانتی ہے پولیس کو بھی اپنی روایتی ذہنیت سے باہر نکلنا ہوگا۔ (5-7-2014 امر اجالا ودیگر اخبارات)

تمام دنیا میں حقوق نسواں اور صنفی مساوات پر بہت زور ہے۔ اس کے باوجود تمام اداروں کے اعلیٰ ترین عہدیداروں میں تمام قابلیتوں کے باوجود خواتین کو تناسب تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ گنی جنی اعلیٰ ترین عہدیداروں C.E.O. میں پیپسی کو Pepsico کی ہنڈرڈ C.E.O. اندرانوئی hdira Nooyi کا نام سرفہرست ہے۔ خواتین کے کیریئر ملازمت وغیرہ اور ان کی خاندانی زندگی میں توازن کے مسئلہ پر انھوں نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو کے ذریعہ صنفی عدل کے بجائے صنفی مساوات کے حامیوں اور عام انسانوں میں بالکل پیدا کردی ہے۔ ہوا یہ کہ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک اعلیٰ عہدیدار این میری سلاٹر Ann Marie Slaw ghter کی کتاب ”خواتین اب بھی سب کچھ حاصل نہیں کر سکتی؟“ پر انٹرویو دیتے ہوئے کولوریڈو امریکہ میں کہا کہ ”میں سوچتی ہوں کہ خاتون سب کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔ ہم ایسا دکھا کرتے ہیں؛ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ طاقتور شمار کی جانے والی خواتین میں سے ایک اندرانوئی نے کہا انسانی جسم میں موجود حساتیاتی گھڑی اور مستقبل بنانے کا کلاک ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ جب آپ کے بچے ہوتے ہیں، تب آپ کو کیریئر مستقبل بھی بنانا ہوتا ہے۔ جب اس کشمکش کے بالکل درمیان میں ہوتے ہیں آپ کو بچوں کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ جب آپ اور عمر دراز ہوتے ہیں تو آپ کے والدین کو آپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اس طرح ہم پس رہے ہوتے ہیں۔ دو مختلف طرح کے تقاضوں کے درمیان) آپ کو روزانہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آپ ایک بیوی ہیں یا ماں ہیں۔ اگر آپ میری بیٹیوں سے پوچھیں گے تو میں قطعی طور سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ مجھے اچھی ماں کے خانہ میں رکھیں گے۔ آپ کو اس کشمکش سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے؛ کیونکہ آپ احساسِ جرم کے ساتھ موت کے دروازہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں احساسِ جرم یا ندامت سے بہت بار موت کے دروازہ تک پہنچی ہوں۔ اپنی دو بچیوں کی پرورش کے دوران پچھلے 34 سالوں میں مجھے اس احساس نے موت کا احساس دلایا ہے۔ خصوصاً جب کہ میں اپنی بچیوں کے اسکول میں مشترکہ چائے پارٹی میں حاضر نہیں ہو سکتی تھی، وہ واپسی پر مجھ سے شکایت کرتی تھیں۔ میں نے اس شکایت سے نمٹنے کا ایک طریقہ نکالا کہ میں نے اسکول سے ان والدین کی فہرست حاصل کر لی جو میری طرح ان پارٹیوں میں شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنی بیٹیوں سے کہنا شروع کر دیا کہ دیکھو میری طرح یہ بھی ہیں، میں اکیلی نہیں ہوں۔ جب بچے نو عمر ہوتے ہیں تب ان کو آپ کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور ان کو وقت نہ دینے کا احساسِ جرم آپ کو

موت تک ستا تا رہے گا۔ (ٹائمس آف انڈیا 4-5/7/2014 نئی دہلی)

تاریخ کی شاید سب سے سنگین اور مہلک اگر کوئی غلطی ہے تو وہ یہ ہے کہ مشین کسی اور نے بنائی اور اس کو چلانے اور رکھ رکھاؤ کے طریقے کوئی اور بنا رہا ہے؛ حالانکہ ہم پلاسٹک کے معمولی ڈبہ اور بوتل کے طریقہ استعمال اور زیادہ بہتر فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس بنانے والی کمپنی کے ہدایت نامہ پر عمل کرتے ہیں؛ مگر اشرف المخلوقات حضرت انسان مرکز کائنات کے معاملہ میں ہم اس اصول کو اپنے نفس کے ہاتھوں گروی رکھ دیتے ہیں آج ہر طرف ترقی کی چمک ہے اونچی عمارتیں، مال، پلازہ، دانش گاہیں، بینک، ہوائی اڈے، ذرائع نقل و حمل، ذرائع علاج و معالجہ، ذرائع معیشت، ذرائع ابلاغ وغیرہ ہیں؛ مگر دنیا آج جتنی پریشان ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہیں تھی۔ قرآن پاک میں اللہ پاک فرماتے ہیں کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا ہے اور باوجود سمجھ بوجھ کے اللہ نے اسے گمراہ کر دیا اور اس کے کان و دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر بھی پردہ ڈال دیا ہے، اب ایسے شخص کو اللہ کے علاوہ کون ہدایت دے سکتا ہے۔ کیا اب بھی تم نصیحت نہیں پکڑ پاتے۔ انھوں نے کہا: ہماری زندگی تو دنیا کی ہی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانہ ہی مار ڈالتا ہے، دراصل انھیں اس کی کچھ خبر ہی نہیں، یہ تو صرف قیاس اور اٹکل سے کام لے رہے ہیں۔ (الجامعہ: 23-24)

دراصل علم اور حقیقت کے مقابلہ قیاس و اٹکل کی گرم بازاری ہے جس نے انسانوں کو ہمیشہ افراط و تفریط میں مبتلا رکھا۔ پوری انسانی تاریخ میں یہی حال ہے۔ کبھی مال و دولت عیش و عیاشی سب کچھ مانا گیا کبھی ہر چیز سے پرہیز اور دنیا سے مکمل پرہیز ہی معراج قرار پائی۔ کبھی دولت اور طاقت کی پوجا ہوئی پھر رد عمل میں رہبانیت کا دور دورہ ہو گیا۔ آج بھی یہی حال ہے، ہم اپنی غیر مکمل معلومات، ناقص ادھوری معلومات اور علم کی بنیاد پر انسان جس پیچیدہ مخلوق کے لیے قانون وضع کرنے لگ جاتے ہیں جو کہ اکثر ایجابی ہونے کے بجائے رد عمل پر مبنی ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ کے مذکورہ دونوں فیصلے اس ضمن میں آتے ہیں۔ پہلے ہم اپنی کم علمی کی بناء پر ناقص نظام زندگی اور فلسفہ زندگی ترتیب دیتے ہیں جو بتاتا ہے کہ یہ دنیا کے مزہ ہی سب کچھ ہیں کھاؤ، پیو، موح کرو اور زمانہ ہمیں موت کی نیند سلا دے گا کھیل ختم ہو جائے گا۔ اب اس فکر و فلسفہ کی بنیاد پر جو تہذیب کھڑی ہوگی اس کا رویہ اخلاقیات، معاشیات، سماجیات ہر معاملہ میں صرف ظاہری فوری فائدہ ”العاجلہ“ پر ہوگا۔ جس اصول، قانون اور اقدار کا فوری فائدہ نہ ہو وہ بیکار ہے۔ وہ بوجھ ہے، اسے ہٹا دو، اس اصول، قدر، قانون کو ختم کر دو۔ اس فکر میں تضاد اور منافقت اہم مظہر ہے۔ یہاں طاقت ہی حق ہے، پر عمل ہوتا

ہے اور بات سماجی انصاف کی ہوتی ہے۔ یہاں نو جوان زنانہ جسموں کو ناپ تول کر ہر زاویہ سے عریاں کر کے ہر ممکن اور نمایاں مقام پر پروسا جاتا ہے اور حفاظت عصمت کے قوانین ایسے بنائے جاتے ہیں، جس میں چھونا، گھورنا، اشارہ کرنا، لمس کرنا، لالچ دینا بھی جیل کی ہوا کھانے کے لیے کافی ہے۔ ایک طرف یہ نظریہ اسکول کالج، ادارہ، بس، ٹرین، پارک، کلب ہر جگہ آزادانہ میل جول کو بڑھاوا دیتا ہے۔ دوسری طرف حفاظت عصمت کے نام پر پرائیویسی اور خصی کر دینے تک کی سزا دیتا ہے۔ ایک غلط رسم و رواج کے کوکھ سے ہزاروں بلائیں جنم لیتی ہیں۔ مشترکہ خاندان اور جہیز کی رسم سے پیدا ہونے والے مسائل پر جو انسانی ذہنوں نے قانون سازی کی، اس کا نتیجہ جہیزی اموات اور خواتین کے بڑے پیمانے پر جلانے جانے کی شکل میں نکلا۔ پھر قانون بنایا گیا کہ شادی کی فلاں مدت کے درمیان اگر شادی شدہ خاتون کو کچھ غیر فطری ہوا تو ساری سسرال والے اندر ہوں گے۔ اس کا نتیجہ وہ نکلا جس کا ذکر سپریم کورٹ نے کیا ہے کہ نئی تعلیم، نئی تہذیب کی پروردہ بد تہذیب دھوکہ کھائی ہوئی نسل نے اس قانونی سہولت کو ہتھیار بنا کر ساس، سسر، نند سب کو جیل پہنچانا شروع کر دیا۔ یہ سب کیوں ہوا؛ کیونکہ معاشرہ میں اکٹھا رہنے کے نام پر مشترکہ بڑے بڑے خاندان رائج ہیں۔ ایک طرف آپ خواتین کو پڑھا لکھا کر جاب کرا کر پیسہ بھی کمانا چاہتے ہیں، پھر آفس جانے سے پہلے بچوں کو ٹفٹن، صاحب کے جوتے پر پاش ان کا ناشتہ، ساس سسر کا چائے، ناشتہ، دوا، اور اپنا میک اپ سب کچھ کرانا چاہتے ہیں، واپسی پر سب کے خنجرے چائے، ناشتہ، رات کا کھانا اور دلجوئی کے ساتھ، بچوں کے ہوم ورک میں مدد کے ساتھ رات میں سکون کی تلاش کو فریضہ بھی انجام دلانا چاہتے ہیں؛ جبکہ مرد کو اس کا آدھا کام کرنا ہے؛ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس غیر انسانی اور ظالمانہ فکر اور عمل پر خود خواتین کا بڑا طبقہ فریفتہ ہے یا ایسا باور کرایا جاتا ہے۔ اندرانوئی جیسی شخصیات اپنی عمر کے جس حصہ میں اپنے دل کے درد کا اظہار کر رہی ہیں، کیا وہ دنیا بھر میں جدید انسان اور فطرت دشمن تہذیب اور نظام کے خلاف کھلی دلیل نہیں ہے؟

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں کے ذریعہ اپنے پہلے کے فیصلوں یا قوانین پر نظر ثانی کا مشورہ اور اندرانوئی کے خیالات صرف اور صرف اس بات کا اظہار ہیں کہ انسان محض اپنی عقل اور تجربہ سے ہی اپنے لیے، پوری کائنات کے لیے اور تمام مخلوقات کے لیے فساد اور افراط و تفریط سے پاک نظام نہیں ترتیب دے سکتا، اسے عقل اور تجربہ کی رہنمائی کے لیے اپنے رب، خالق، مالک، الہ کی ہدایت لینی ہوگی، ورنہ یہی معاشی، سماجی، فکری فساد و تباہی ہمارا مقدر ہوگی، جو آج پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، انسانیت کو لازماً اپنے خالق کی طرف پلٹنا ہوگا۔

بہترین شخص

از: ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی
مدیر: سہ ماہی ”صفا“ حیدرآباد

معاشرہ میں بہترین شخص کا مصداق کسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ظاہر ہے، ہر شخص اپنے ذوق، نقطہ نظر اور سوچ کے مطابق الگ الگ دے گا، اہل علم اور ارباب دانش کی نظر میں ہو سکتا ہے اس کا مستحق وہ ہو جس نے علم و دانش کی سنگلاخ وادیوں میں آبلہ پائی کی ہو اور معرفت و حکمت کی بلند و بالا چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہو؛ جبکہ مادیت کے متوالوں اور اسباب و وسائل کے دیوانوں کی نگاہیں اس ٹائٹل کے حوالہ سے ان افراد پر مرکوز ہو جائیں گی جنہوں نے مال و دولت کی ریس میں بہتوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہو، جن کا عشرت کدہ ان کے بہت سے جاننے والوں کے لیے رشک و حسد کا مرکز ہوا اور بینک بیلنس نہ صرف عزیز واقارب؛ بلکہ انکم ٹیکس والوں کے لیے بھی مرکزِ توجہ بنا ہوا ہو، اس کے برعکس شہرت و ناموری کو سب کچھ سمجھنے والے یہ ٹائٹل اسے دینا پسند کریں گے جس کا ڈرائنگ روم تمنے اور انعامات سے بھرا ہوا ہو اور قریہ و شہر پرستاروں کی بھیڑ سے اٹا پڑا ہو، ہو سکتا ہے بعض لوگوں کا ذہن اس کے لیے ان سوشل ورکروں کی طرف جائے جو اپنے لیے نہیں؛ بلکہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں، ان سب آراء کا المیہ یہ ہے کہ یہ سب محدودیت کا شکار اور زندگی کی بس ایک خاص جہت کی آئینہ دار ہیں؛ اس لیے کہ ہو سکتا ہے ان حوالوں سے بہترین سمجھا جانے والا شخص زندگی کے وسیع تناظر میں بدترین شخص ثابت ہو۔

اس سوال کا شاندار اور جامع جواب وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دیا گیا، آپ ﷺ کی نظر میں ”بہترین شخص“ کے ٹائٹل کا مستحق وہ ہے جس کا سلوک اپنی گھر والی کے ساتھ بہتر
 ین ہو: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (سنن الترمذی: 4062)

ظاہر یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ازدواجی معاملات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے؛ لیکن اگر سنجیدگی سے اس چیز کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا

کہ بہترین شخص کے انتخاب کے لیے گھروالی کے ساتھ سلوک سے بہتر کوئی معیار نہیں ہے، یہ اتنی جامع اور وسیع کسوٹی ہے جس پر کسی کو بھی پرکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی وہ بہترین شخص ہے یا اس نے شرافت کا محض مکھوٹا لگایا ہے؛ اس لیے کہ لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں ویسے ہوتے نہیں ہیں؛ بلکہ ظاہر تو کبھی کبھی اتنا پر فریب ہوتا ہے کہ اس سے اچھے خاصے جہاں دیدہ اور تجربہ کار لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں؛ چنانچہ بہت سے لوگ دینداری کا لبادہ اس مہارت کے ساتھ اوڑھتے اور تقویٰ و طہارت کی مصنوعی کریم سے اپنی صورت کو اس قدر پرکشش اور چمکدار بنا لیتے ہیں کہ لوگ ان کی شرافت و دینداری کی قسمیں کھانے میں بھی نہیں جھکتے؛ لیکن اگر ان کی عالمی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ظاہری شرافت و دینداری سب گھر سے باہر ہے، گھر کے اندر یہ شخص انتہائی بدتمیز، خود غرض اور شقی القلب ہے، باہر شرافت و مروت کا دم بھرنے والا گھر میں انتہائی وحشی ہے اور ہر دن ظلم و بربریت کی ایک نئی داستان رقم کرتا رہتا ہے، اسے نہ اللہ و رسولؐ کے احکام و تعلیمات کی پرواہ ہے اور نہ ہی اسوۂ رسولؐ سے گھر کو منور کر کے اسے جنت کا ایک ٹکڑا بنانے کی فکر، جہاں اضطراب کے بجائے سکون کا ڈیرا ہو، نحوست کے بجائے سعادت کا بسیرا ہو، تنگی کے بجائے فراخی، نفرت کے بجائے محبت اور کراہت کی تیرگی کے بجائے انسیت کے دیپ جھلملاتے ہوں۔

اس طرح بیوی کے ساتھ سلوک ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص کی اصلی تصویر نظر آ جاتی ہے؛ اس لیے کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی بالادستی کے جوہر عموماً کمزوروں کے سامنے ہی دکھانا پسند کرتا ہے، صنف نازک سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بیویاں عام طور پر کمزور و بے بس و بے کسی کا پیکر ہوتی ہیں، اپنے عزیز واقارب اور حامی و ناصر سے دور بڑی حد تک شوہر اور اس کے گھر والوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تھوڑی سی کوتاہی شوہر کے آتش غضب کو بھڑکا دیتی ہے وہ ان کی معمولی سی غفلت سے چراغ پا ہو جاتا ہے، عام طور پر وہ بیوی کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس خیال سے کہ اس کے ٹکروں اور چٹھڑوں پر پلنے والی ہستی کی حیثیت ہی کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ تو ہین آمیز رویہ اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، نازیبا کلمات کا استعمال تو عام سی بات ہے، بعض گھروں میں تو معاملہ گالی گلوچ اور مار پیٹ تک پہنچ جاتا ہے، اس معاملہ میں جاہل اور تعلیم یافتہ کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، اس حمام میں سبھی ننگے ہیں، بعض تعلیم یافتہ افراد اپنے اس طرح کے رویہ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے

بعض اقوال کا سہارا لینے سے بھی نہیں چوکتے، جیسے یہ کہ شوہر کی حیثیت مجازی خدا کی ہے، اسلام میں اگر اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو بیویوں کو اپنے شوہر کو سجدہ کرنا پڑتا، وہ اس ہندو فلسفہ کے قائل ہوتے ہیں جو بیویوں کو داسی اور شوہروں کو سوامی قرار دے کر بیویوں کے ساتھ کسی بھی سلوک کی اجازت دیتا ہے، جب کبھی عورتوں کے حقوق کی بات اٹھتی ہے تو مسلمان یہ کہہ کر اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ اسلام نے اس طرح تمام حقوق آج سے پندرہ سو سال قبل عورتوں کو دے دیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے عورتوں کو معاشرہ میں جو عزت و احترام اور وسیع و جامع حقوق عطا کیے ہیں، مغرب اپنی طویل جدوجہد کے باوجود اس تک نہیں پہنچ سکا ہے؛ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کے عطا کردہ حقوق مسلم خواتین کو حاصل ہیں، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں کچھ استثناءات ہوں؛ لیکن عام طور پر مسلم خواتین کے حالات غیر مسلم خواتین سے اچھے نہیں ہیں، وہ بھی انھیں کی طرح گھریلو تشدد کا شکار ہیں، مظلومیت ان کا مقدر ہے اس سے بعض خوش نصیب کو ہی نجات مل پاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بہترین شخص ہونے کے لیے جو معیار متعین فرمایا ہے، اس کی روشنی میں اگر حیاتِ طیبہ کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی ذات اس حوالہ سے بھی عالمِ انسانیت کے لیے مثالی نمونہ ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں اتاریں اور اس سے اپنی عائلی زندگی کو سنواریں۔

رشتہ ازدواج میں اللہ تعالیٰ نے مودت و رحمت کا ختم فطری طور پر ڈال دیا ہے، جو لوگ اس کی آبیاری و دیکھ بھال کرتے ہیں، وہ نہ صرف اس کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کی گھنی و ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے سفر کو آسان و سہانا بنا لیتے ہیں، اس کے برعکس جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے، وہ اس کے فیضان و برکات سے بہت حد تک محروم ہی رہتے ہیں، یہ رشتہ اپنی پائیداری اور برگ و بار کے لیے باہمی اعتماد، تعاون و ہمدردی، ایثار و قربانی، عزت و احترام اور پیار و محبت کا محتاج ہوتا ہے، آپ کی ازدواجی زندگی پر اس کی گہری چھاپ تھی، آپ ﷺ کا سلوک اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ہمیشہ ہمدردانہ و مشفقانہ ہوا کرتا تھا، آپ ﷺ ان کی دلجوئی و احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھتے تھے، ایک سفر میں جب انجھہ نامی غلام نے اس اونٹ کو تیز چلانے کی کوشش کی جس پر بعض ازواجِ مطہرات سوار تھیں تو آپ ﷺ نے انھیں آہستہ چلانے کا حکم دیا اس خیال سے کہ کہیں وہ ڈرنے جائیں یا

انہیں کوئی تکلیف نہ ہو (صحیح بخاری: 6159)

”حضرت صفیہؓ ایک سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ تھیں، انہوں نے اس بات پر رونا شروع کر دیا کہ وہ جس اونٹنی پر سوار تھیں وہ بہت آہستہ چلتی تھی، آپ ﷺ ان کے پاس گئے اپنے دست مبارک سے ان کے آنسو پوچھے اور دلاسا دیا“ (سنن النسائی: 9072) آپ ﷺ بیویوں کی تعریف میں بھی کمی نہیں کرتے؛ بلکہ برملا اس کا اظہار کیا کرتے تھے؛ چنانچہ ایک مرتبہ فرمایا ”خدیجہ سے مجھے شدید محبت ہے“ (صحیح مسلم: 6231) حضرت عائشہؓ کے بارے میں فرمایا: ”عائشہؓ کی فضیلت دیگر عورتوں پر ایسی ہی ہے جیسے شریذ کی دیگر کھانوں پر“ (صحیح البخاری: 3341) آپ ﷺ پلیٹ میں اس جگہ سے کھانا کھاتے تھے، جہاں سے عائشہؓ کھاتی تھیں“ (صحیح مسلم: 466) آپ ﷺ اپنی بیویوں کی دلجوئی کا اس حد تک خیال رکھتے تھے کہ جب ایک ایرانی پڑوسی نے آپ ﷺ کی پسندیدہ ڈش ”مرق“ بنایا اور آپ ﷺ کو دعوت دی تو آپ ﷺ نے اس دعوت کو قبول نہیں فرمایا؛ اس لیے کہ اس نے آپ ﷺ سے تنہا آنے کے لیے کہا تھا، اور آپ ﷺ کو یہ گوارہ نہ تھا کہ شریک حیات کے بغیر دعوت میں جائیں، لہذا جب اس نے آپ ﷺ کے ساتھ عائشہؓ کو بھی دعوت دی تو آپ ﷺ نے دعوت قبول فرمائی اور تشریف لے گئے“ (صحیح مسلم: 5268) آپ ﷺ ازواج مطہرات کا نہ صرف حد درجہ خیال رکھتے تھے؛ بلکہ ان کے مزاج شناس تھے اور ان کے چشم وابرو کے اشارے کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے؛ چنانچہ ایک مرتبہ ”عائشہؓ سے فرمایا: میں یہ جان جاتا ہوں کہ کب تم مجھ سے ناراض ہو اور کب خوش؟ انہوں نے دریافت کیا: وہ کیسے یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب تم ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو: رب ابراہیمؑ کی قسم اور جب خوش رہتی ہو تو کہتی ہو: رب محمدؐ کی قسم“ (صحیح مسلم: 6238)

آپ ﷺ ازواج کے ساتھ اس حد تک عزت و احترام کا معاملہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت ”صفیہؓ“ آپ ﷺ کے اعتکاف کے دوران آپ ﷺ سے مسجد نبویؐ میں ملنے آئیں تو جب وہ واپس جانے لگیں تو آپ ﷺ احتراماً انھیں مسجد کے دروازہ تک چھوڑنے کے لیے تشریف لائے“ (بخاری: 2011)

رائے کی اہمیت

خواتین کو گھروں میں چونکہ عام طور پر کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی اس وجہ سے نہ اہم

امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے، تمام اہم فیصلے شوہر خود کرتے ہیں اور بیگم کا کام صرف سمع و طاعت ہوتا ہے؛ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نہ صرف گھریلو امور بلکہ امت سے متعلق بعض امور میں بھی بوقت ضرورت ازواج سے مشورہ کیا کرتے تھے، اور ان کے مشوروں پر عمل بھی کیا کرتے تھے؛ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع سے جب آپ ﷺ کے حکم کے باوجود حضرات صحابہؓ میں سے کسی نے بھی نہ قربانی کی اور نہ بال منڈائے تو آپ ﷺ اس صورت حال سے کافی پریشان ہوئے اور خیمہ میں آکر اپنی اہلیہ ام سلمہؓ سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا، انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ یا رسول اللہ! آپ باہر تشریف لے جائیے اور اپنی قربانی ذبح کیجیے اور حلق کرا لیجیے اور واپس آجائیے، آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا جسے دیکھ کر حضرات صحابہؓ بھی بادل ناخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے قربانی کی اور پھر بال منڈائے (صحیح البخاری: 4995)

گھریلو امور میں تعاون

شریک حیات کے ساتھ گھریلو امور میں مشارکت و تعاون جس میں عام طور پر شوہر حضرات کم ہی دلچسپی لیتے ہیں؛ بلکہ بعض تو کسر شان سمجھتے ہیں یہاں تک کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بھی بیوی پر انحصار کرتے ہیں؛ جبکہ آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ گھریلو کام میں اپنی بیویوں کا ہاتھ بٹاتے تھے؛ چنانچہ عائشہؓ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ ﷺ کا گھر کے اندر کیا معمول ہوا کرتا تھا تو انہوں نے بیان کیا کہ آپ ﷺ گھر کے کاموں میں گھر والوں کی مدد کیا کرتے تھے، (صحیح البخاری: 667) ایک اور روایت میں انہوں نے بیان کیا کہ آپ ﷺ اپنے کپڑے خود ہی سی لیا کرتے تھے، چپل کی مرمت کر لیتے تھے، اس کے علاوہ، وہ سارے کام کرتے تھے جو عام طور پر مرد حضرات اپنے گھر میں کرتے ہیں (مسند الامام احمد: 24510)

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ زندگی کی یکسانیت معمول کے کام اور سنجیدہ و ڈھوس اعمال کے تسلسل سے بور ہو جاتا ہے، قوی مضحل، اعصاب پڑمرده اور دلچسپیاں مدہم پڑ جاتی ہیں، ایسے میں ضرورت ہوتی ہے کچھ تبدیلی، تنوع اور چٹھٹی چیزوں کی جس سے تھکن کے غبار چھٹ جائیں اور انسان تازہ دم ہو کر نئی آن اور نئی شان کے ساتھ کشاکش حیات کی جانب پھر سے متوجہ ہو، کھیل تفریح یا آج کی اصطلاح میں انٹریٹمنٹ اس میدان میں تیر بہدف کا کام کرتا ہے، اسلام جو کہ

فطری مذہب ہے، وہ انسان کی اس فطری طلب پر قدغن لگانے کے بجائے صحیح و درست انداز میں اس کی تسکین کی راہیں کھلی رکھتا ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف جلوت بلکہ خلوت میں بھی اسے برتا ہے اور رزم و بزم کے علاوہ اپنی خانگی زندگی کو بھی اس کی پھلجھڑی سے گلزار و گلزار بنائے رکھا ہے؛ چنانچہ ایک مرتبہ ”حبشہ کے کچھ لوگ آکر مسجد نبوی کے سامنے اپنے کرتب اور کھیل تماشہ کا مظاہرہ کر رہے تھے، آپ ﷺ نے خود ہی حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا یہ تماشہ دیکھنا چاہو گی؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا، آپ ﷺ دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے اور عائشہؓ آپ ﷺ کے کندھے پر ٹیک لگا کر کھیل دیکھتی رہیں“ (النسائی: 8858)

ایک غزوہ سے واپس آتے ہوئے آپ ﷺ نے قافلہ کو آگے جانے کا حکم دیا، ان کے جانے کے بعد آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی، (سنن ابی داؤد) حضور ﷺ جب گھر پر نہیں ہوتے تو حضرت عائشہؓ کی سہیلیاں آجاتیں اور سب مل کر کھیلا کرتی تھیں، حضور ﷺ کے آتے ہی سب ادھر ادھر چلی جاتیں، آپ ﷺ انھیں بلواتے اور خود باہر چلے جاتے، اس طرح حضرت عائشہؓ کو سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارنے اور کھیلنے کے مواقع فراہم کرتے۔ (صحیح مسلم: 6240)

نا پسندیدہ بات

عام زندگی کی طرح ازدواجی زندگی بھی نشیب و فراز سے گزرتی ہے اور من میں لڈو پھوٹنے والی باتوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تن میں آگ لگا دینے والی باتیں بھی سننے کو ملتی ہیں، کاشانہ نبوت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، اگر آپ ﷺ کو زواج مطہرات سے کوئی نامناسب بات سننے کو ملتی تو اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کے بجائے حکیمانہ انداز میں اس طرح غلطی کی تصحیح فرماتے کہ اصلاح بھی ہو جائے اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو؛ چنانچہ ایک مرتبہ ”رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت صفیہؓ زار و قطار رو رہی ہیں، آپ ﷺ نے رونے کا سبب دریافت فرمایا: انہوں نے عرض کیا کہ حفصہؓ نے مجھے یہودی کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیا ہے، آپ ﷺ نے انھیں تسلی دی اور فرمایا کہ اس میں عار کی کوئی بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایک اعزاز ہے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے، تم ان سے کہہ دو کہ میرے شوہر محمد ﷺ ہیں، باپ ہارون علیہ السلام ہیں اور چچا موسیٰ علیہ السلام؛ لہذا میرے سامنے کیا اہمیت جتنائی ہو“ (سنن الترمذی: 6240)

ازدواجی چشمک

میاں بیوں کے درمیان نوک جھونک، بحث و تکرار اور آپسی شکر رنجی بھی عجیب چیزیں ہیں، پیار و محبت کی اس نگری کے اصول و ضابطے عام دنیا کے آئین و قوانین سے بالکل الگ ہوتے ہیں یہاں ہار میں جیت ہوتی ہے اور جیت میں ہار؛ لہذا وہ ناداں جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں، اس رشتہ کی لطافت و لذت سے محرومی ان کا مقدر بنتی ہے، دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس طرح کے مواقع پر کیا انداز ہوا کرتا تھا، ایک مرتبہ ”حضرت عائشہؓ“ کا کسی سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رائے کا اختلاف ہو گیا، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ ہمارے درمیان تم کس سے مفاہمت کرانا پسند کرو گی، کیا عمرؓ پر تم متفق ہو؟ عائشہؓ نے کہا کہ عمرؓ کے مزاج میں سختی ہے؛ اس لیے میں انھیں اس معاملہ میں لانا نہیں چاہتی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تم یہ پسند کرو گی کہ تمہارے باپ ابو بکرؓ ہم دونوں کے درمیان صلح کرادیں، انھوں نے کہا: ہاں یہ ٹھیک ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ کو بلوایا، جب وہ آگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہؓ سے پھر پوچھا کہ پہلے تم اپنی بات کہو گی یا میں؟ عائشہؓ نے کہا کہ پہلے آپ ہی اپنی بات کہیں؛ لیکن بالکل ٹھیک ٹھیک کہیں، یہ سنتے ہی ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عائشہؓ کو ایک تھپڑ رسید کر دیا اور اس سے پہلے کہ مزید پڑے عائشہؓ جلدی سے بھاگ کر حضور ﷺ کی اوٹ میں آگئیں، یہ صورت حال دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ جاسکتے ہیں، میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلایا تھا، جب ابو بکرؓ چلے گئے تو آپ ﷺ نے عائشہؓ سے کہا: ادھر قریب آؤ؛ لیکن وہ نہ آئیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی تو باپ کے ڈر سے مجھ سے چپکی جا رہی تھیں، اور اب کیا ہو گیا؟ تھوڑی دیر بعد حضرت ابو بکرؓ واپس آئے تو دیکھا دونوں ہنس رہے ہیں، تو انھوں نے کہا: مجھے بھی اپنی صلح میں ویسے ہی شریک کریں، جیسا کہ ناچاقی کے دوران شریک کیا تھا، (ابوداؤد: 4665) آپ ﷺ اگر کسی بات پر اہلیہ سے شدید ناراض ہوتے تو اس کا اظہار اس طرح کرتے کہ انھیں اکیلا چھوڑ دیتے، جیسا کہ آپ نے اس وقت کیا جب ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ سے کثیر نان و نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔

کیر کٹر سے متعلق شکوک و شبہات

ازدواجی رشتہ کی خوب صورت شاہراہ پر کبھی کبھی ایسے پیچ و خم بھی آتے ہیں، جو آگے کے سفر

کو مشکل بنا دیتے ہیں، بہت سے لوگ تو ایسے مواقع پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتے اور حادثہ کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ بیوی کے کیرکٹر سے متعلق شکوک و شبہات ایسی چیز ہے جس کا تصور ہی کسی بھی شوہر کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے، یہ وہ حساس موضوع ہے جو بسا اوقات ایک شریف اور سنجیدہ شخص کو بھی مشتعل کر دیتا ہے اور بعض تو جوشِ غضب میں انتہائی خطرناک اقدام تک کر جاتے ہیں، ایسے مواقع سے حضور ﷺ کو بھی گزرنا پڑا، اس طرح کہ آپ ﷺ کی چہیتی بیوی حضرت عائشہؓ کے کیرکٹر پر بعض شر پسندوں نے کچھڑا اچھالے اور اس افواہ کو مدینہ کی گلی کوچے میں پھیلا دیا، اس کی خبر جب آپ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے محض بے بنیاد افواہ کی بنیاد پر بیوی کو قصور وار گرداننے کے بجائے مسجدِ نبوی کے منبر سے ان کا دفاع کیا؛ چنانچہ فرمایا: ”اے مسلمانو! میرے اہل سے متعلق بعض تکلیف دہ بات مجھ تک پہنچی ہے، خدا کی قسم میں ان کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا“ اس کے بعد آپ ﷺ نے براہِ راست حضرت عائشہؓ سے بات کی اور فرمایا: مجھ تک تمہارے بارے میں ایسی ایسی باتیں پہنچی ہیں، اگر تم اس تہمت سے بری ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری براہِ راست واضح کر دے گا اور اگر تم سے ایسا کوئی گناہ ہو گیا ہے، تو اللہ سے توبہ و استغفار کرو!

یہ محض چند نمونے ہیں جو سیرتِ نبوی سے یہاں پیش کیے گئے، ورنہ سیرتِ نبوی اس طرح کے واقعات سے بھری پُری ہے، مسلمان اگر اسے اپنی زندگی میں اپنالیں تو وہ بہت سی ازدواجی پیچیدگیوں سے نجات پا جائیں گے۔



یکتائے زمانہ - عبداللہ ابن مبارکؓ

از: مولانا محمد مجیب الرحمن دیودرگی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

نام و نسب

نام: عبداللہ، والد کا نام: ابن مبارک تھا، ان کے والد دراصل ترکی النسل تھے، ۱۱۸ھ میں ان کی پیدائش ہوئی، اور ۱۸۱ھ میں وفات ہوئی، کل عمر ۶۳ سال ہوئی، مرو میں ان کا قیام کافی بڑے گھر میں تھا۔ (البدایہ والنہایہ ۱۹۱/۱۰)

توصیفی کلمات

کسی بھی شخصیت کا تعارف اور اس کی اہمیت کا اندازہ قائم کرنے میں اس کے ہم عصروں کے تاثرات کا بڑا دخل ہوتا ہے، منصف مزاج ہم عصر یا تو شخصیت کے سلسلے میں تعریف و توصیف کرتے ہیں، یا نقد و جرح کرتے ہیں، سفیان ابن عیینہ مشہور محدث ہیں، انہوں نے ابن مبارک کی کچھ یوں تعریف کی: میں نے ابن مبارک کے حالات پر غور کیا، اور صحابہ کرامؓ کے حالات پر غور کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابن مبارک میں آپ ﷺ کی صحبت و معیت کے علاوہ تمام فضائل موجود ہیں، صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی صحبت کی برکت سے اعلیٰ و بلند ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ۱۹۱/۱۰) اسماعیل ابن عیاش فرماتے ہیں: روئے زمین پر ان جیسا کوئی نہیں، ہر نیکی کو میں نے ابن مبارک میں پایا جو اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کر رکھی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کی ضیافت فرماتے؛ حالاں کہ وہ خود روزے سے ہوتے۔ (ایضاً) عطاء بن مسلم نے عبیدؓ سے پوچھا کہ کیا تم نے ابن مبارکؓ کو دیکھا ہے؟ تو جواب دیا کہ ہاں دیکھا ہے، نہ ان جیسا میں نے کسی کو دیکھا اور نہ ہی ان جیسا کوئی ہو سکتا ہے، مشہور صوفی و بزرگ فضیل بن عیاضؓ ابن مبارک کی تعریف میں یوں گویا ہیں: ان جیسا کوئی ان کا نائب نہ ہو سکا، عبدالرحمن ابن مہدی جو مشہور روایۃ حدیث میں سے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں نے ابن مبارک جیسا اس امت کا خیر خواہ نہیں دیکھا، مشہور مؤرخ، مفسر قرآن

ابن کثیر الدمشقی نے ان اوصاف کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا: ایک جانب ابن مبارک علم فقہ کے ماہر ہیں، تو دوسری جانب علم کے بحر بے کراں ہیں، اور ساتھ ہی امت کے لیے بے پناہ مال کو لٹانے والے سخی ہیں، اور اس سے بڑھ کر شجاعت و بہادری میں بے مثال مظاہرہ کرنے والے مجاہد بھی ہیں، ان میں خیر کی کئی خصلتیں جمع کر دی گئیں تھیں۔ (البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۹۱) ابن مبارک کی طرز زندگی دیکھ کر سفیان ابن عیینہ کہتے تھے کہ میری زندگی کا کم از کم ایک سال ابن مبارک کی طرح گزر جائے؛ حالانکہ تین دن بھی ایسے نہیں گزر سکتے۔ (ایضاً)

شجاعت و بہادری

ان کے ذاتی اوصاف میں سے یہ اہم ترین خوبی تھی کہ موت سے بے خوف و خطر ہو کر شوق شہادت میں میدانِ جہاد کی طرف رواں دواں ہوتے، اور نفسِ نفیس جہاد میں شریک ہوتے، اور نہایت ہی بہادری کا مظاہرہ فرماتے، عموماً علم کی دولت ہاتھ آ جانے کے بعد انسان کسل مندی اور سستی کا مظاہرہ کرتا ہے، اور اگر مال بھی آجائے تو اپنے آپ کو بقیہ تمام چیزوں سے ماورا شمار کرتا ہے؛ لیکن ابن مبارک کی یہ امتیازی خوبی تھی کہ مال و دولت کے ڈھیر لگے ہوئے ہونے اور علم جیسی عظیم ترین نعمت ہاتھ آنے کے باوجود وہ میدانِ جنگ سے اپنے آپ کو مستغنی نہیں سمجھتے، ایک جنگ کا واقعہ لکھا ہے کہ دشمنوں کی صفیں تیار ہو گئیں، ادھر مسلمان بھی تیار ہو گئے، ایک کافر جوان آگے بڑھا، اس نے آواز دی آؤ مقابلہ کے لیے، مسلمانوں کی صف سے ایک جوان اپنے منہ پر کپڑا باندھ کر نکل پڑا، اور اس کا کام تمام کر دیا، ایسے ہی پھر دو کافر نکلے، جن کا مؤمن شخص نے کام تمام کر دیا، اس کے بعد وہ مؤمن شخص مسلمانوں کے لشکر میں آ کر منہ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عبداللہ ابن مبارک ہیں۔ (صفۃ الصفو ۲/۳۲۹) یہ ابن مبارک کی بہادری ہی تھی کہ وہ ہمیشہ جہاد کے لیے کمر بستہ رہتے، اور اس کا اہتمام بھی فرماتے۔

سخاوت

جیسے حاتم طائی کی سخاوت مشہور ہو گئی تھی، اسی طرح طبقہ علماء میں ابن مبارک کی سخاوت لوگوں کے مابین نہایت مشہور ہے، ابن مبارک کی سخاوت کے بے شمار قصے ہیں، ورنہ بے شمار سخاوت کی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی خبر عام نہ ہوئی، کئی مقروضین ایسے ہیں کہ جن کے قرضوں کو ابن مبارک نے ادا کر دیا، اور مقروضین کو اس بات کا بھی پابند بنادیا کہ وہ کسی سے اس راز کو فاش نہ کرے۔ (صفۃ الصفو ۲/۳۲۸) بلکہ ابن مبارک خود اپنے سلسلہ میں کہتے ہیں: میری تجارت کی

غرض ہی علماء و صوفیاء اور مشائخین کی امداد کرنا ہے، ایک دفعہ فضیل بن عیاضؒ جو خود مشہور بزرگ ہیں، ان سے کہنے لگے اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں کبھی تجارت نہ کرتا۔ (صفۃ الصفوة ۲/۳۲۶) یہی وجہ تھی کہ ابن مبارک اپنی ذات پر مال بہت کم خرچ کیا کرتے، اور ساتھیوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی کوشش کرتے، اسماعیل ابن عیاشؒ نے فرمایا تھا کہ ابن مبارک عجیب و غریب آدمی ہیں، جو ساتھیوں کی توفیافت فرماتے ہیں اور خود روزہ رکھتے ہیں۔ (البدایہ ۱۰/۱۹۲) فقرا، ہر سال ایک لاکھ درہم خرچ کرتے، نیز عابدین و زاہدین پر رأس المال کا نفع خرچ کرتے۔ (ایضاً) حج کا زمانہ آتا تو ابن مبارک کے ساتھ حج کے لیے مرو کے لوگ جاتے، ابن مبارک کہتے کہ تم سب اپنا مال جمع کرو، سب لوگ اپنا اپنا خرچ ابن مبارک کے پاس جمع کر دیتے، اس خرچ کو لے کر ابن مبارک صندوق میں ناموں کے ساتھ محفوظ رکھتے، اور حج کے لیے چلے جاتے، مدینہ میں، مکہ میں حاجیوں کی عمدہ کھانے سے ضیافت فرماتے، ان حاجیوں کے اہل و عیال کے لیے اشیاء خریدواتے، پھر واپس مرو پہنچتے تو ان سب حاجیوں کی دعوت کرتے، اس کے بعد ان کی رقم ان حاجیوں کو واپس کر دیتے۔ (البدایہ ۱۰/۱۹۲) ایک دفعہ حج کے لیے نکلے تو راستہ میں ایک پرندہ مر گیا، آپؐ نے اسے کوڑے دان میں ڈال دینے کا حکم دیا، اس کے بعد ساتھی آگے نکلے، ابن مبارک وہیں ٹھہرے ہوئے رہے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ کوڑے دان پر ایک لڑکی آئی، اور اس مردہ پرندہ کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئی، عبد اللہ بن مبارک اس کے پیچھے گئے، اس کے احوال دریافت کیے، تو لڑکی نے اپنی بد حالی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ چند دنوں سے تو ایسی حالت ہو گئی کہ ہمارے لیے مردار حلال بھی ہو گیا ہے، ہمارے والد کے پاس جو کچھ مال تھا، لوگوں نے ظلم کر کے ان سے مال چھین لیا، اور انھیں قتل بھی کر دیا، ان حالات کے سننے کے بعد ابن مبارکؒ نے خازن کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ نفقہ و خرچ کتنا ہے؟ خازن نے جواب دیا کہ ایک ہزار دینار، ابن مبارک نے فرمایا: ہمارے مرد تک پہنچنے کے لیے بیس (۲۰) دینار کافی ہیں، یہ رکھ لو، اور بقیہ رقم اس عورت کو دے دو، خازن نے اسی طرح کیا، اس کے بعد ابن مبارکؒ نے فرمایا: اس سال ہمارے لیے حج کرنے سے زیادہ افضل یہ تعاون کرنا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۱۰/۱۹۱)

غور کیجیے! ابن مبارکؒ جیسے جید عالم دین و فقیہ و امام وقت نے حج جیسی عظیم عبادت کے بجائے غریب کی امداد کو اہمیت دی، اور محتاج و مضطر کا تعاون فرمادیا، اور حج کا ارادہ ملتوی فرمادیا، نیز یہ بھی فرمایا کہ ایسے موقع پر جب کہ ہمارے ارد گرد ہمارے پڑوس میں محتاجوں کے گروہ رہتے

ہوں، تو ہمیں نفلی حج کے لیے کوشش کرنے کے بجائے ان محتاجوں کی امداد پر توجہ دینا، ان فقراء کی خبر گیری کرنا، ان کی ضروریات پورا کرنا زیادہ افضل ہے، اس واقعہ میں ان مالداروں کے لیے انتہائی عبرت ہے کہ جولاکھوں روپے نفلی حج و عمروں میں لگانے میں مصروف ہیں، اور اپنے محتاج پڑوسیوں کی خبر گیری نہیں کرتے، اپنے غریب رشتہ داروں پر کچھ خرچ نہیں کرتے، اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ نفلی حج و عمرہ کے بجائے غریبوں کی امداد کرنا زیادہ افضل ہے، پڑوس میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو سودی قرضوں میں مبتلا ہیں، کتنے ہی رشتہ دار اور محتاج ایسے ہیں جو ہسپتالوں کے چکر کاٹ رہے ہیں، کئی مریض تو ایسے ہیں جنہیں دوائی کے لیے رقم دستیاب نہیں ہے، کئی بے بس مریض تو اس حال تک پہنچ گئے ہیں کہ غربت کی وجہ سے امراض کا علاج کرانے سے عاجز ہیں اور موت ہی کے انتظار میں بسر مرگ پر پڑے ہوئے ہیں، ویسے میں یہ مالدار ایک سے زائد نفلی حج و عمرہ میں ایک کثیر تعداد میں مال صرف کر رہے ہیں، کیا ان سے روز قیامت باز پرس نہیں ہوگی؟ کیا انھیں ابن مبارک کا یہ طرز عمل غرباء کی امداد پر آمادہ نہیں کرتا؟

ابن مبارک کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں: میں خراسان سے بغداد تک آپ کے ساتھ رہا، کبھی میں نے آپ کو تنہا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (صفحة الصفوة ۳۲۴/۲)

حدیث شریف کا اشتغال

مالداری کے باوجود علم کی جانب جھکاؤ، علم سے لگاؤ، اہل علم کی قدر دانی علم کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا بہت کم ہی لوگوں کے نصیب میں آتا ہے، انھیں بانصیب افراد میں ایک ابن مبارکؒ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم حدیث جیسی مبارک شئی سے تعلق و وارفتگی نصیب فرمائی، ابن مبارکؒ گھر میں زیادہ رہتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ کیا تمہیں گھر میں وحشت نہیں ہوتی؟ جواباً کہنے لگے کہ مجھے وحشت کیسے ہوگی کہ میں آپ ﷺ کے اقوال کے ساتھ رہا کرتا ہوں۔ (صفحة الصفوة ۳۲۴/۲) ابن مبارکؒ کی حالت بیان کرتے ہوئے نعیم ابن حماد کہتے ہیں کہ ابن مبارکؒ جب کتاب الرقاق پڑھتے تو نہایت آبدیدہ ہو جاتے، کوئی ان سے اس دوران سوال کرنے یا ان کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرتا۔ (صفحة الصفوة ۳۲۵/۲)

آخرت کا خوف

مال کے ساتھ پہلے تو علم ہی کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے؛ مگر جب یہ دونوں جمع ہو جائیں اور ان میں عمل بھی جمع ہو جائے تو نور علی نور کا مصداق ہو جاتا ہے، لیکن ایسا حسین امتزاج ناپید نہیں تو

کمیاب ضرور ہے؛ لیکن ابن مبارکؒ کی ذات ہی خود مبارک تھی جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ تمام تر خوبیاں بیک وقت جمع فرمائی تھیں، عملی زندگی میں وہ انتہائی فعال اور متحرک تھے اور ہر وقت انھیں اپنی آخرت کی فکر دامن گیر رہتی؛ چنانچہ ایک دفعہ مکہ المکرمہ میں ابن مبارکؒ کو زمزم سے لبریز پیالہ پیش کیا گیا تو آپؒ نے قبلہ رخ ہو کر یہ حدیث مبارک بیان فرمائی: ”مَاءٌ زَمْزَمٌ لِّمَا شُرِبَ لَهُ“ (ترجمہ: آپ ﷺ نے فرمایا: زمزم کا پانی جس نیت سے پیا جاتا ہے، اس کے لیے کافی ہوتا ہے) اس کے بعد ابن مبارکؒ نے فرمایا: یہ پانی میں قیامت کی پیاس بجھانے کے لیے پیتا ہوں، اس کے بعد آپؒ نے نوش فرمایا۔ (ایضاً)

عبادت و قبولیت دعا

ابن مبارکؒ پر اللہ کا خاص کرم یہ بھی تھا کہ انھیں عبادت وغیرہ کا بھی خاص شوق عنایت فرمایا تھا، اسی بنا پر راتوں میں ابن مبارکؒ کا عجیب و غریب حال ہوا کرتا کہ راتوں میں اتنا زیادہ روتے کہ ان کی داڑھی تر ہو جاتی، حاسدین یہ دیکھ کر کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر انھیں ہم پر فضیلت دی ہے۔ (صفحہ ۲۳۶/۳۳۷) ابو وہبؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مستجاب الدعوات بھی بنایا تھا، ایک مرتبہ ایک اندھے شخص پر سے ابن مبارکؒ کا گزر رہا تو اس اندھے نے ابن مبارکؒ سے سوال کیا کہ آپ میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹا دے، ابن مبارکؒ نے دعا کر دی، اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی بینائی لوٹا دی، ابو وہبؒ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس کو دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ (ایضاً ۲۳۹/۳۴۰)

حقیقی بادشاہت

حکمران وہ لوگ نہیں جو جبراً عوام پر مسلط ہو جائیں اور اپنا حکم نافذ کرنے لگیں؛ بلکہ حکمران حقیقی معنی میں وہ ہے جنہیں قوم حقیقی معنی میں دل و جان سے چاہنے لگے، ان کی ہر ہر ادھر پر مٹنے لگے، ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیتاب ہو، ان کی اتباع کو اپنے لیے کامیابی کا زینہ سمجھے، بادشاہوں کے مقابلے بزرگوں کی جو حکومت ہوتی ہے، وہ اس طرح عوام کے دلوں پر وہ راج کرتے ہیں؛ چنانچہ ایک دفعہ ابن مبارکؒ رقعہ آئے، لوگ جوتے چپل چھوڑ کر ان کے پیچھے جانے لگے اور غبار بہت زیادہ اڑنے لگا، خلیفہ ہارون رشید کی باندی محل کی کھڑکی سے یہ سب نظارہ کر رہی تھی، اس باندی نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا: یہ خراسان کے عالم دین ہیں، جو رقعہ آئے ہوئے ہیں، لوگ انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے جمع ہو رہے ہیں، اس باندی نے یہ سن کر کہا کہ ہارون رشید حقیقت میں بادشاہ نہیں ہیں؛ بلکہ حقیقتاً بادشاہ تو یہ ہیں؛ کیوں کہ ان کے جمع

کرنے کے لیے کوئی پولیس و مددگار کی کوئی ضرورت نہیں۔ (البدایہ والنہایہ ۱۱۵/۱)

اقوال

بزرگوں کے اقوال میں اللہ تعالیٰ نے عجیب و غریب تاثیر رکھی ہے، بعض بعض دفعہ بزرگوں کا ایک ایک جملہ وہ اثر دکھلا جاتا ہے، جو اوروں کی کئی تقاریر اور کئی مضامین اثر نہیں دکھلا سکتے، بعض دفعہ بزرگوں کے ایک ہی جملہ میں سامعین کی زندگی ہی تبدیل ہو جاتی ہے، ابن مبارکؒ کے بھی بے شمار اقوال ایسے ہیں، ایک شخص کو آپؒ نے نصیحت فرمائی: اپنی قدر پہچانو۔ (صفۃ الصوفیہ ۲/۳۲۹)

ابن مبارکؒ فرماتے ہیں: ہم نے علم دنیا کے لیے سیکھا، لیکن علم ہی نے ہمیں دنیا چھوڑنا سکھایا۔ (صفۃ الصوفیہ ۲/۳۳۰)

ایک دفعہ ابن مبارکؒ نے فرمایا: تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں کبھی تجارت نہ کرتا۔ (صفۃ الصوفیہ ۲/۳۲۶)

ایک دفعہ آپؒ نے فرمایا: دنیا والے دنیا کی بہترین چیز کھانے سے قبل دنیا چھوڑ کر چلے گئے، سامعین نے سوال کیا: وہ بہترین چیز کیا ہے؟ آپؒ نے جواب دیا: اللہ کی معرفت۔ ابن مبارکؒ فرمایا کرتے: شبہ کا ایک درہم لوٹا دینا، لاکھوں درہم صدقہ کرنے سے زیادہ بہتر ہے، ایک دفعہ فرمایا: جس شخص میں جہل کی کوئی ایک صفت بھی ہو وہ جاہل ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو اسی بنیاد پر نصیحت کی ہے، آپؒ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ آدمی کون لوگ ہیں؟ تو آپؒ نے جواب دیا: علماء، بادشاہ کون ہیں؟ تو جواب دیا: زاہد لوگ بادشاہ ہیں، پھر فرمایا: بیکار لوگ وہ ہیں جو دین بیچ کر کھایا کرتے ہیں۔ (صفۃ الصوفیہ ۲/۳۲۶)

الغرض اللہ تعالیٰ نے ابن مبارکؒ کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا، مال و دولت کے ساتھ جو دو سخا جیسی اہم نعمت بھی اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو اوفر مقدار میں عطا کی تھی، جس کا آپؒ موقع بموقع استعمال فرمایا کرتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو علم و عمل جیسی اہم نعمت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، جس کا آپؒ نے بخوبی لحاظ کیا اور اس کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا، آپؒ کا زہد و تقویٰ انتہائی مثالی تھا، جس پر علماء و صلحاء... رشک کیا کرتے تھے، حضرت سفیان ابن عیینہ جیسے عالم دین کہتے ہیں کہ میں خود ابن مبارکؒ جیسی زندگی گزارنا چاہتا ہوں؛ مگر مجھ سے نہیں ہو سکتا، لہذا آپؒ کی زندگی میں انسانی طبقات کے لیے بے شمار نمونہ، عبرتیں اور اسباق موجود ہیں، جن سے استفادہ کر کے زندگی گزارنا چاہیے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!